افسانوی مجموعہ

شیشے کی دیوار

مصنف

شیخ بشیر احمد

ٹینگہ پورہ نواب بازار سری نگر ۱۹۰۰۰۲ کشمیر

ISBN-978-93-80691-25-1

نام کتاب : شیشے کی دیوار

مصنف : شیخ بشیر احمد

کمپوزنگ : بشارت احمد بابا۔ چھتہ بل (سرینگر)

سرورق : الیف۔ اے۔ آہنگر (فردوس بک کمپوزنگ سینٹر)

مطبع : پرنٹ کیرز الڈگر، سرینگر 9797094999

زمانہ : ۲۰۱۶ء سنہ ۲۰۱۷ء

زیر اہتمام : اردو اکادمی جموں کشمیر سرینگر

عام قیمت : ۱۵۰ روپے لائبریری قیمت: ۲۵۰ روپے

رابطہ : 09858989900

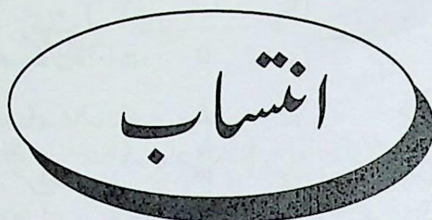
اس کتاب کی طباعت کیلئے جموں وکشمیر اکیڈیمی آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب کی گئی آراٗ سے کلچرل اکیڈیمی کا باواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈیمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

ملنے کا پتہ

۱۔ شیخ بشیر احمد ٹینگہ پورہ نواب بازار سرینگر

۲۔ کتاب گھر لال چوک سرینگر۔

۳۔ میزان پبلشیرز بٹہ مالو سرینگر



شریکِ حیات

مرحومہ حلیمہ اختر

کے نام

فہرست

شیخ بشیر احمد کے فن کا اثبات

ریاست جموں و کشمیر میں جن معاصر افسانہ نگاروں نے اُردو افسانہ نگاروں کو مقام و وقار بخشا ہے اُن میں نور شاہ، عمر مجید، پروفیسر بدخشی، وریندر پٹواری، خالد حسین، آنند لہر اور بلراج راج بخشی کے ساتھ ساتھ شیخ بشیر احمد کا نام بھی بے حد اہم ہے۔

شیخ بشیر احمد گذشتہ کئی دہائیوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہو کر قارئین سے داد حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' کچھ عرصہ قبل ہی شائع ہوا تھا۔ زیر نظر افسانوی مجموعہ ''شیشے کی دیوار'' اپنے مشمولات کی وجہ سے ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل کرے گا اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ ''شیشے کی دیوار'' میں لگ بھگ بیس (۲۰) افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ بشیر احمد افسانوی بیانیہ کے تازہ ترین تقاضوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی عصری ادبی رجحانات اور رویوں سے بھی وہ آگاہ ہیں۔ دراصل آج کا فکشن آج کے دور کی ثقافتی صورتِ حال کی عکاسی جس ایمانداری اور فنکاری کے ساتھ کر رہا ہے وہ ایمانداری اور فنکاری شیخ بشیر احمد کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ شیخ بشیر احمد نے پورے برصغیر کی سطح پر عام افسانوں کو درپیش مسائل کی تہوں اور طرفوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں اُن کا افسانہ ''شیشے کی دیوار'' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل افسانوں خصوصاً دھوئیں کی تحریر، ''المیہ پرندہ، چھوٹا قد اور روداد چمن'' وغیرہ کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کسی بھی واقعہ، سانحہ، جذبہ، احساس، تجزیہ یا مشاہدہ کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنے کا فن آتا ہے۔

شیخ بشیر احمد کی شخصیت اور فن کے امتیازات کئی ہیں۔ اولین امتیاز ان کی خود اعتمادی ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کے ادراک و واقعات کے انتخاب اور افسانہ کی بنت اور بیانیہ ثابت کرتے

ہیں کہ شیخ بشیر احمد ذات، زندگیاں اور زمانہ کی کسی بھی مثبت یا منفی لہر کو گرفت میں لے کر افسانہ کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ جیسے معاشرے میں پھیلی ہوئی عیاریاں (دھوئیں کی تحریر) جدید تہذیب میں اخلاقی قدروں کا زوال (شیشے کی دیوار) وفا شعاری اور بے وفائی (چھوٹا قد) ایماندارانہ ازدواجی زندگی کی طمانیت (پچھتاوا) شیخ بشیر احمد کشمیر کے افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے وہ اکثر و بیشتر افسانوں کی بنیاد کشمیر کے عصری حالات و کوائف، کرداروں اور واقعات پر ہی رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں شیخ بشیر احمد قابل تعریف، جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چند اقتباسات سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''میری اور میری جیسی دوسری لڑکیاں، جو صبح سویرے شنکر آچاریہ کی پہاڑی سے یہاں ہاؤس بوٹوں میں گلدستے لا کر سیلانیوں سے اس کی قیمت لیتی ہیں۔ یہ قیمت طان پھولوں کی ہوتی ہے۔ چاہئے کتنی بھی ہو۔ پھول والی کی نہیں۔ کیونکہ پھول والی نہ دل دیتی ہے نہ دل لیتی ہے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔'' (افسانہ یہ کیسی صبح)

''باہر آسمان پر بادلوں کے کھڑکنے سے لمحہ بھر کیلئے بجلیاں چمکتیں اور غائیب ہوتی رہیں جو شاید ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ کرشن جی کی مورتی کی نگاہیں دلہا دلہن کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس کے ہونٹوں پر خیف سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔'' (افسانہ چھوٹا قد)

ایک ہو کا عالم تھا۔ لوگ سہمے سہمے حیران و پریشان سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے تھے۔ افراتفری کے ماحول میں ایک دن نوری رات گئے اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی کہ شاید ابھی نہ تو ابھی آئے۔ لیکن جب سحر کی سپیدیٔ مشرق کی اور سے نمودار ہوئی اور وہ گھر لوٹ کے نہ آیا تو وہ بے چین ہوگئی۔ اس دن سے اب تک اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ جانے کہاں چلا گیا۔ اپنی یادیں چھوڑ کر جانے کہاں روپوش ہوگیا، ورنہ بیسار تلاش کرنے پر ضرور اس کا پتہ چل جاتا۔ (افسانہ روداد چمن)

کشمیر کے پس منظر میں شیخ بشیر احمد نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں کشمیر میں پھیلی عسکریت اور غیروں کے علاوہ خود اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ پولیس والوں کی موقع پرستی اور بدعنوانی، درویش نما بہروپیوں کی خود غرضی، عام کشمیری خواتین کی سادہ لوحی اور غربت، نوجوانوں کی بے روزگاری، مفلسی کی لعنتیں اور حالات

بدلنے کی اُمید جیسے مختلف موضوعات پر شیخ بشیر احمد نے بڑی سادگی سے افسانے لکھے ہیں لیکن جہاں ضرورت محسوس ہوا ہے علاموں اور استعاروں سے بھی کام لیا ہے۔ عام طور پر ان کے افسانوں کے عنوانات علامتی اور استعاراتی ہوتے ہیں۔ مثلاً ''پرندہ''، ''شیشے کی دیوار''، ''دھوئیں کی تحریر'' اور ''بے ثمر لمحہ'' وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں۔ افسانہ ''پرندہ'' ایک اساطیری افسانہ ہے۔ حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے واقعے کو بنیاد بنا کر شیخ بشیر احمد نے ایک عمدہ افسانہ لکھا ہے۔ قاری یہ افسانہ پڑھتے ہوئے الجھتا نہیں کیونکہ شیخ بشیر احمد کو افسانے میں استعاروں، علامتوں اور اساطیر کے برتاؤ کا ہنر آتا ہے۔ چونکہ شیخ بشیر احمد تعمیری ذہن رکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ اسلئے دوسرے کئی افسانوں کی طرح ''پرندہ'' میں بھی انہوں نے تعمیری اور مثبت قدروں کی حمائت کی ہے۔ لیکن شیخ بشیر احمد کی مقصدیت ان کے فن کو مجروح نہیں کرتی ہے بلکہ ان کے افسانوں کی معنویت اور اثر پزیری کو پروقار بناتی ہے۔ شیخ بشیر احمد کے افسانوں میں رومانیت کی ہلکی ہلکی آنچ ہوتی ہے لیکن شیخ بشیر احمد رومانی نہیں حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اور کسی بھی اسلوب میں افسانہ لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ شیخ بشیر کے بیانیہ میں پیچیدگی نہیں ہوتی عصری زندگی کے درمیان سے چنے گئے فطری اور زمینی الفاظ کے شیخ بشیر کے مافی الضمیر کی ترسیل، قاری تک بڑے ہی سہل انداز میں ہوجاتی ہے۔ شیخ بشیر احمد نے خواتین کی نفسیات اور خواتین پر ہونے والی جنسی زیادتیوں پر ''المیہ'' جیسے افسانے ضرور لکھے ہیں لیکن شیخ بشیر احمد کو اپنی تہذیبی اور اخلاقی قدریں زیادہ عزیز ہیں اس لئے وہ عام معنوں میں جنسی افسانے لکھنے سے پرہیز ہی کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی شیخ بشیر احمد ایک ایسے منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں جنہیں معاصر اردو افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام ملنا ہی چاہئے۔ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' کے بعد ''شیشے کی دیوار'' میں شامل افسانوں کے مطالعہ سے، کسی بھی غیر جانبدار قاری کے ذہن میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے۔

(پروفیسر قدوس جاوید)

شیخ بشیر احمد، وادی کے افسانہ نگار

عموماً، ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اتفاق سے ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ بس برسوں سے بچھڑی ہوئی کوئی شخصیت ایک دن اچانک مل جاتی ہے۔ سرینگر کے افسانہ نگار شیخ بشیر احمد کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ایک مختصر وقت کے لئے رابطہ میں آئے تھے۔ پھر نہ جانے کیوں بیس برس تک سکوت رہا۔ آخر انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ جس دن ان کا خط ملا۔ میری مُسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اس حسن اتفاق پر میں نے عہد کیا تھا کہ بشیر صاحب ایسے فرشتہ صفت انسان کو جی سے لگا کر رکھوں گا۔ اب حال یہ ہے کہ ہم ایک محبوب کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

ویسے تو وادی کے سبھی قلمکاروں سے مجھے انسیت رہی ہے۔ جو میرے رابطے میں آئے اُن سے بھی اور جنہیں میں نے پڑھا ہے، ان سے بھی لیکن زیادہ قربت بشیر صاحب ہی سے رہی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اُن کے اندر ایک افسانہ نگار پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے ابتدائی دور کے افسانے مجھے بھجواتے رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زیادہ دنوں ڈل کے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھے نہیں رہیں گے، ایک دن پہاڑ کی بلندیوں کو چھونے لگیں گے اور آج جب ان کے اندر کا افسانہ نگار نوجوانی کی سرحدوں سے کافی آگے نکل چکا ہے تو مجھے اپنی سوچ کی صحت پر اعتبار آ گیا ہے۔

ان کے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلنے والے افسانے میں نے دیکھے ہیں اور آج ان کی تیز گامی کا گواہ بھی ہوں۔ ہر چند کہ سبھی افسانہ نگار افسانے کی تڑپ رکھنے والے ہی ہوا کرتے ہیں۔ لیکن بشیر صاحب کی سی شدید تڑپ گنتی کے چند قلمکاروں میں ہی پائی جاتی ہے اور پھرتا خیر ان کے ہاں بالکل نہیں ہے۔ میں بھی افسانے لکھتا ہوں لیکن کیلنڈر کے کتنے ہی اوراق نہ جانے کب اُلٹ جاتے ہیں اس کا پتہ ہی نہیں چلتا جبکہ بشیر صاحب تیسرا چوتھا اور پانچواں افسانہ لکھ کر میرے

سامنے آکھڑے ہوتے تھے۔ مجھے حسد بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب دل سے دعا نکلتی ہے۔

بشیر صاحب کی ذات اور شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے محترم مظفر ایرج نے کچھ یہی کہا تھا کہ "اپنے وعدے اور وقت کے بڑے پکے اور پابند ہیں، جس کے منتظر تھے بشیر احمد صاحب آپ ہی ہیں، بولنے پر آتے ہیں تو بسیار گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اسی طرح قلم برداشتہ لکھنے والوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ ہمہ وقت مشغول رہنے والے ہر کام کیلئے کمربستہ، احباب پر جان چھڑتے ہیں۔ بڑے نیک صفت انسان، مہربان اور قدردان، یوں سمجھیں ان کی ذات اور شخصیت ایک خوبصورت گلدان سی ہے جس میں ہر طرح کے رنگ و بُو کے پھول سجے ہوتے ہیں"

سچ تو یہ ہے کہ میں جو کہنا چاہتا تھا۔ وہی کچھ مظفر صاحب کی زبان سے ادا ہو گیا ہے۔ بلا شبہ بشیر صاحب انہی اوصاف سے متصف ہیں۔ لیکن وہ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ کشمیری خون ان کی رگوں میں گردش کرتا ہے، گرچہ یہ قدرتی امر ہے لیکن کشمیریوں کا خون جب حد سے زیادہ اُبال کھانے لگتا ہے تو اپنے ہی وطن کی تقدیر کا چہرہ دھندلا کر رکھ دیتا ہے۔

وادی کے اُردو ادب میں افسانے کا بھی اپنا ایک وجود ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کہتے ہیں، "سارے قلمکار گھر کے اندر اور باہر مادری زبان بولتے رہے۔ لیکن فکر و خیال کے نقوش اُردو کے دامن پر ابھارتے رہے۔ ان کی تخلیقات ملک کے موقر جرائد میں چھپتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام ادبی حلقوں میں جانے پہچانے ہیں۔"

پھر انہوں نے چند ایسے قلمکاروں کا ذکر کیا جن کے خدمات افسانوی ادب میں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، علی محمد لون، اختر محی الدین، ویدراہی، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری نور شاہ، عمر مجید اور بشیر شاہ وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

بشیر صاب انہی بزرگوں کی روایات کے امین ہیں اور پورے انہماک سے فنِ افسانہ کے اندرون میں اُترتے دکھائی دیتے ہیں، انہوں نے اپنے افسانوں کا خمیر اپنی مٹی اور آس پاس کے ماحول سے اٹھایا ہے۔ جو کچھ دیکھا اسے بلا کم و کاست افسانے کے قالب میں ڈھالتے چلے گئے ہیں۔ ان کا قلم کبھی جراحت کا کام کرتا دکھائی دیتا ہے تو کبھی زخموں پر مرہم رکھنے کا، کہ ایک فنکار کا یہی منصب بھی ہے۔

بشیر صاحب کے افسانوں میں کشمیر کی کوکھ میں پلی [illegible] بھی پایا جاتا ہے اور سماجی

نابرابری، سیاسی شعبدہ بازی، انسانی رشتوں کی ناہمواری اوراخلاقی قدروں کی پامالی کے مکروہ چہرے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جنہیں اپنی نگارشات میں انہوں نے چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کا ہنر جانتے ہیں اور اسے افسانے کی تفہیم تک پہنچنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اچھے افسانے کی تعریف بھی یہی ہے کہ افسانہ نگار افسانے کو وہاں لے جاکر چھوڑتا ہے کہ قاری اس کا مطلب خود تلاش کرے۔ وہی کامیاب افسانہ کہلاتا ہے۔ اس خوبی پر بشیر صاحب کی نظر ہے۔ اسی لئے ان کے بیشتر افسانے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

اُردو افسانہ جن ادوار سے گذرا ہے ان میں شکست وریخت کا سامنا اسے کرنا پڑا ہے۔ آج افسانے میں موضوع کی شمولیت نشانہ بحث ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ نے سارے موضوعات برت لئے ہیں۔ کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جو ان کے ہاتھوں سے پھسل گیا ہو۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو پریم چند کا افسانہ ''بیوہ''، راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی''، عصمت کا ''جڑیں''، کرشن چندر کا ''مہالکشمی کا پل''، منٹو کا ''کھول دو'' اور نور شاہ کا ''کشمیر کہانی ۹۰ء'' ایسے بہترین افسانے ہیں۔ جو ہمیں مختلف موضوعات کا درشن کراتے ہیں۔ چنانچہ آج کا افسانہ نگار جس موضوع کو ہاتھ لگائے گا۔ وہ اس چکرویو سے باہر نہیں نکل پائے گا۔ اسی بنیاد پر آج اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ افسانے میں اصل چیز ہے پیشکش، پھر طرز اسلوب اور لب ولہجہ کا جدید آہنگ، یہ سب آج کے قاری کو مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔ لہٰذا آج کے لکھنے والوں کو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہی ہوگا۔

بشیر صاحب نے ہر چند کہ ایک عرصہ ہوا افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ لیکن ان کے سامنے اب بھی آگ کا دریا ہے جسے پار کرنا ہے کہ کوئی آنچ ہی کسی ادیب کی رگوں میں شعلہ بن کر اسے کامیاب تخلیق کی طرف اُبھارتی ہے۔ لکھنا جسے کہتے ہیں آسان نہیں ہے بڑے جوکھم کا کام ہے۔ اسی لئے بڑے سے بڑے ادیبوں کو یہی کہتے سنا گیا ہے کہ آج تک ہم نے وہ نہیں لکھا ہے جو ہمیں لکھنا چاہیئے تھا۔ چیخوف نے کہا تھا میں نے پانچ سو افسانے لکھے ہیں لیکن ان میں صرف پانچ ایسے ہوں گے جنہیں زندہ جاوید کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ادب کی دنیا میں کوشش تو اونچی پرواز کی ہو لیکن نظر ہمیشہ زمین کی طرف رہے۔ اس سے قلمکار کو بجائے خود ایسی توانائی ملے گی جو اسے آگے کی طرف ہی لے جائے گی۔

کشمیر کے لکھنے والوں کو یہ گلہ رہا ہے کہ ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ نظر انداز کئے

گئے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج وہ منظر نامہ نہیں ہے۔ بشیر صاحب جیسے کئی قلمکار آج ہر جگہ دکھائی دینے لگے ہیں۔ ان میں شاعروں اور تنقید نگاروں کی بھی ایک کھیپ دکھائی دیتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ بقول نور شاہ صاحب ریاست کے اہل قلم کی بیش بہا ادبی خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹیوں میں ریسرچ ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ وقت بدلا ہے تو اس کے بدلنے کی قوت کا سرچشمہ خود وہاں موجود تھا۔ جس کی نشاندہی پر فیسر حامدی کاشمیری یوں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

''بلاشبہ اُردو کیلئے ریاست میں ایک سازگار ماحول ہے۔ نئی نسل کے لکھنے والے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اُردو میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں اور ملک کے کسی بھی خطے کے لکھنے والوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں''

اس حقیقت کی روشنی میں بے اعتنائی کی شب کا آخری پہر بھی گذر جاتا ہی ہے۔ ویسے آج کی یہ کم بخت ادبی دنیا کم ہی کسی کو لایق اعتنا سمجھتی ہے۔!

بشیر صاحب وادی کے وہ افسانہ نگار ہیں جنہیں کہانی کہنے کا ہنر آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں نکھار آیا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ادب کے کسی خاص مکتب فکر سے وبستہ نہیں ہیں۔ آزادانہ اظہار خیال ان کی کاوشوں کا محور ہے۔ اس لحاظ سے وہ قطعی غیر جانبدار ہیں۔ اپنے تجربات و مشاہدات ہی کو انہوں نے اپنی نگارشات میں ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی لئے مقبولیت ان کی دہلیز پر کھڑی ہے۔

بشیر صاحب بہت تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ''شیشے کی دیوار'' کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ جو بلاشبہ نقش اوّل سے کہیں زیادہ لایقِ توجہ ہوگا اور جس طرح ''شیشے کی دیوار'' سے آمنے سامنے کے مناظر صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کی کہانیوں کا سچ بھی قارئین اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی سے جو روحانی مُسرت حاصل ہوگی اسے میں بھی بشیر صاحب کے ساتھ شیئر کروں گا انشاء اللہ!

احمد کلیم فیض پوری

بھساول (مہاراشٹر) ۵ جنوری ۱۳ء

تقریظ

یہ 1982ء کی بات ہے جب جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر نے میرے اوّلین افسانوی مجموعہ ''شیشے کی دیوار'' کی اشاعت کے لیے گرانٹ منظور کی تھی مگر چند ناگزیز وجوہات کی بنا پر میں کتاب چھپوانے سے قاصر رہا۔ البتہ ۲۰۱۱ء میں میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' منظر عام پر آیا۔

اب کی بار میں نے اپنے سابقہ افسانوی مجموعہ ''شیشے کی دیوار'' کے کئی افسانوں کو نئے سرے سے ترتیب دیکر چند نئے افسانے بھی شامل کرنے کے ساتھ چھپوانے کا ارادہ کیا ہے۔ جو آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔

میں ان سبھی کرم فرماؤں، بہی خواہ قلمکاروں اور ناقدین کا احسان مند ہوں جنہوں نے ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کر کے میری کوششوں کو سراہا اور میرا حوصلہ بڑھا کر مجھے نئی کہانیاں ضبط تحریر میں لانے کی ترغیب دی۔

یہاں یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اپنے اوّلین افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' کو منظر عام پر لانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور میرے صاحب کتاب ہونے کے خبط میں عجلت پسندی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس پر ستم یہ کہ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ کمپوزنگ کی جلد بازی اور غیر تسلی بخش پروف ریڈنگ نے پوری کر دی۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی ایک لمبی مدت گزرنے کے بعد میں اپنے آپ کو بحیثیت افسانہ نگار صاحب کتاب اور ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے دیکھنے کا متمنی ہوا۔ اس کوشش میں کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر عمر کے آخری پڑاؤ پر احساس ہوا کہ کامیابی جیسے لفظ کے معنی سے اب بھی نا آشنا اور محروم ہوں۔

اسے کیا کہا جائے کہ مجھے اردو زبان سے بے انتہا لگاؤ ہے۔اسی لگاؤ نے میرے جنون کو اتنی جلا بخشی کہ میں لکھتا رہا، لکھ رہا ہوں اور لکھتا رہوں گا۔

غرض افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' پر معتبر ادیبوں کے تاثرات کے ساتھ بے انصافی ہوگی اگر میں ان کے مفید مشوروں پر عمل نہ کروں اور ان کا شکریہ ادا نہ کروں۔

اب میرا یہ دوسرا افسانوں کا مجموعہ ''شیشے کی دیوار'' آپکے ہاتھوں میں ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ کتنے اردو کے قدر دان اپنے تاثرات نیک نیتی سے دے کر اِس مجموعے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اپنے زرین خیالات سے نواز کر مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔دراصل یہ مجموعہ آپ کی آراء اور میری محنت کا ثمرہ ہے۔

میں دوبارہ ان تمام صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔جنہوں نے ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' پر اپنے نیک مشورے اور بامعنی تبصرے تحریر کرکے مجھے شاد کر دیا۔

افسانوی مجموعہ کی ترتیب و تزئین میں پُرخلوص معاونت کرنے پر اپنے قلمکار دوست عبدالرشید راہگیر (لداخی) کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔آخر پر اسلم ابن وفا بھدرواہی اور ماسٹر غلام نبی بابا کا بے حد ممنون ہوں۔جنہوں نے تندہی سے اس مجموعے کی کمپوزنگ میں پڑی غلطیوں کو درست کرنے میں میری مدد کی۔

میرا اگلا افسانوی مجموعہ ''کلی کی بے کلی'' بہت جلد چھپنے والا ہے۔ساتھ ہی سماج میں چندر چی بسی برائیوں پر مشتمل مضامین کی کتاب ''طاغوتی سوچ کے مُضر رسان اثرات'' آخری مرحلہ سے گزر رہی ہے۔انشاءاللہ تعالیٰ جلدی ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔

شیخ بشیر احمد



یہ کیسی صبح......؟

اُسے آنے والے لمحوں کا کوئی ادراک نہیں تھا۔

جب تک اس کے ابا جان زندہ تھے سارا گھر خوشیوں سے بھرا ہوا تھا سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا۔ ہر چہرہ ہنستا مسکراتا اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ انور علی اکلوتا نور چشم۔ انوکھا مزاج لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کی بے فکری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا۔ جو چیز اس کا دل موہ لیتی اسے پورا کیا جاتا۔ ہر چند کئی برسوں سے اس کے ماں باپ نے اپنے سینے میں یہ خواہش پال رکھی تھی کہ ان کا ہونہار لاڈلا بیٹا امتیازی نمبرات لے کر ایم اے کرے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھے۔ کچھ کر دکھانے کے قابل بنے لیکن وہ ان کی خواہشات کو اپنے ذہن وقلب میں کوئی جگہ نہیں دے رہا تھا۔

وہ زندگی کی چکا چوند دلکشی اور رنگینی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ایک دن اس کے ابا جان بمبئی تاج ہوٹل پر ہوئے دہشت گردوں کی کارروائی میں داغ مفارت دے گیے۔ رفتہ رفتہ بیتے یادوں کی نسبت سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا۔ زندگی اجیرن بن کر ستاتی رہی۔ مگر نوکری کی تلاش میں اسے بمبئی کی سڑکوں کی زیادہ خاک نہ چھاننا پڑی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ٹیوشن پڑھاتے ہوئے اس کی شناسائی اثر ورسوخ والوں سے ہوگئی تھی، جس کے سبب ایک نامی ٹریول ایجنسی میں بطورِ ایجنٹ کی نوکری ہاتھ آگئی۔ شاید یہ اس کی ماں کی دعاؤں کا پھل تھا۔

شوہر کی جدائی سے اس کی ماں اکیلی سی ہوگئی تھی۔ ایک نامعلوم سا بوجھل پن دل کی بے چینیاں اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ پیدا کر کے اسے لہولہان کرتی رہیں ۔ عجیب وغریب خیالات ستاتے رہتے۔ ایک ایک لمحہ ڈسنے کو آتا رہا۔ سارا ماحول افسردگی کا شکار ہو چکا تھا جو برداشت سے باہر لگ رہا تھا۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے اس نے بہلانے کا ارادہ کرلیا اور اپنے ہی خاندان سے ایک خوبصورت لڑکی نسرین پسند کرلی۔ جو اس کے چچیرے بھائی کی سالی تھی۔ اس بارے میں انور علی سے دریافت کرتی رہی ہوں

بیٹے انور! نسرین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

"اماں! میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"لیکن بیٹے۔ اس گھر کو ایک بہو کی ضرورت بھی تو ہے۔ ویسے اگر تم نے کوئی اور لڑکی پسند کی ہو تو......"

"نہیں اماں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہوتی تو بتا دیتا۔ اس بات پر پھر کبھی بحث کرینگے کیونکہ اس وقت میں ایجنسی کے دورے پر جا رہا ہوں۔" انور علی نے اگرچہ بات کا رخ بدل کر ماں کو چپ کرا دیا مگر وہ خود بڑا مغموم تھا کہ اماں ان کی شادی کی فکر میں پریشان ہے اور اُسے ٹور پر جانے کی فکر ستا رہی تھی۔

پچھلے چند ہفتوں سے یہ خبریں اخبارات میں متواتر نظر آتی رہیں کہ وادی کشمیر میں دہشت گردوں کی کئی ٹولیاں سرحد پار کر کے داخل ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں آئے دن کے فسادات، مظاہرے، ہڑتالیں، سنگبازی کے واقعات سے خوف کھا کر اکثر ٹورسٹ وہاں جانے کا پروگرام بدل رہے تھے اور جو وہاں موجود تھے وہ بھی واپس بھاگنے کے لئے موقعہ کی تاک میں لگے تھے۔ حال کے پیش نظر ایجنسی کو لاکھوں روپوں کا خسارہ ہونے کا اندیشہ تھا۔

دوسری اہم بات جو مشہور ہو گئی تھی ان مزاحمتی ٹولیوں میں سے کسی ایک گروپ میں تحریک کا ایک نامی سرغنہ گل خان بھی شامل تھا جس نے شہر کے ایک مضافاتی علاقے گرین بیلٹ میں اپنا نیٹ ورک بچھا رکھا تھا۔ اپنی جان کی پروا کئے بغیر انور علی ٹریول ایجنسی کے کام سے کشمیر جانے کی تیاری میں لگ گیا۔ مگر وہ اس راز کا انکشاف اپنی ماں کے سامنے نہ کر سکا۔

وہ جانتا تھا اس طرح اماں کی ممتا اسے روک لے گی ایسی صورت میں اُسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔ ملازمت کے معاملے میں وہ پنکھ پکھیرو ثابت ہوا۔ اسلئے خاموش ہی رہا۔ ایجنسی نے روانگی سے پہلے اس پر سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ دوسرے دن ماں سے رخصت لے کر انور علی بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو گیا۔

شنکر آچاریہ پہاڑی کے دامن میں یہی کوئی ساٹھ ستر گھرانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ٹین پوش چھتوں کے اینٹ پتھر اور گارے سے بنے دو منزلہ مکانوں میں زیادہ تر مزدور طبقات کے لوگ رہتے تھے۔ یہ محنتی اور سادہ لوح لوگ عموماً بیوپار، کلرکی، اونچی نیچی سرکاری و نیم سرکاری

عمارتوں ہوٹلوں اور دکانوں سے لگے باغ باغیچوں میں باغبانی کیا کرتے۔ معمولی پڑھے لکھے نوجوان لڑکے بطور سیلز مین اور فر فر انگریزی زبان بولنے والے بحیثیت گائیڈ کام کیا کرتے تھے۔ جس کیلئے انہیں مناسب معاوضہ ملتا تھا یہی ان کی روزی کا وسیلہ تھا۔

بہار کی رعنائی ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر شاخ وگل میں دوبارہ نئی زندگی و تازگی لوٹ کر آ جاتی۔ ذرّہ ذرّہ مسکرا اٹھتا ہے۔ دور دور کے مقامات سے شیدائیوں کا قافلہ در قافلہ اُمڈ پڑتا ہے۔ سال کے لگ بھگ آٹھ مہینوں تک گیسٹ ہاؤسوں، ہوٹلوں، ڈونگوں اور ہاؤس بوٹوں میں تانتا لگا رہتا ہے۔

تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے انور علی کو ''بیوٹی کوئین'' نامی ہاؤس بوٹ میں جگہ مل گئی۔ یہ ہاؤس بوٹ حاجی عبدالصمد نامی ہانجی کا تھا۔ جس نے اپنی خوش گفتاری اور دیانت داری سے کافی نیک نامی کمائی تھی۔

انور علی نے آج رات اس ہاؤس بوٹ میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ تا کہ وہ شام سے رات گئے تک گرد و پیش کا خوب نظارہ کر سکے شام کی سیاہی میں ڈل کے پانی کے اندر ہاؤس بوٹوں کے برقی قمقمے جب اپنی روشنیاں بکھیر کر جھلملانے لگتے ہیں۔ تب سطح آب پر آسمان کے تارے اپنا عکس دکھا کر جیسے بتا رہے ہوتے ہیں۔ کہ آج کی رات آسمان دھرتی پر اتر آیا ہے۔

شکاروں کے آنے جانے سے پانی میں جو ارتعاش پیدا ہوتا تھا اُس سے قمقموں کی روشنیاں آب سطح پر ایسے بکھر رہی تھیں کہ ایک جل تھل پیدا ہو رہا تھا۔ پانی پر ڈولتا مکان نما بوٹ اُسے پہلی بار ہی تو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

انور علی ان نظاروں میں ایسا کھو گیا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ وہ ایجنسی کے کس کام کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ ملی ٹینسی کے کارن حالات کا جائزہ لینے اور ٹورازم کے خاص خاص لوگوں سے ملنے اور ایک رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داری اسکے سپرد تھی اور ہاؤس بوٹ میں آج کا قیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ لیکن قدرت کے نظاروں میں کھو کر سب کچھ جیسے بھول ہی گیا۔ رات کو کب اُسے نیند آئی اور کب جاگا اسے کچھ پتہ نہ چلا۔

سورج عقب کی زبرون پہاڑی سے کب کا نمودار ہو گیا تھا۔ اسکی آڑی ترچھی کرنیں کمرے میں اپنا ڈیرا جمائے بیٹھی تھیں۔ دفعتاً اس نے آنکھیں کھولیں۔ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ڈل کو خاموشی کی چادر اوڑھے محو خواب دیکھا۔ البتہ آس پاس پیڑ پودوں پر طائران خوش نوا کی بھانت بھانت بولیاں

سنائی دے رہی تھیں۔ایک عجیب ساسماں بندھا تھا۔وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔دفعتاً اس کے کانوں میں ہلکی مترنم سی Bell سنائی دی۔وہ چونک پڑااور دروازہ کھول کر دیکھا۔ایک حسین معصوم لڑکی گلدستہ پیش کررہی تھی۔اُسے ٹورسٹ جان کر وہ اپنا کام سرانجام دینے آئی تھی۔

انورعلی اس معصوم خوبصورت لڑکی کے ہاتھ میں رنگین پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر دیدیں پھاڑ پھاڑکر دیکھنے لگا۔وہ زیرلب مسکرا کر بولی۔

''گڈ مارننگ!''شہد گھلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔قبل اس کے انورعلی کوئی جواب دیتا،لڑکی اندر داخل ہوئی اور گلدان سے باسی پھول اٹھا کر کھڑکی سے باہر پانی میں پھینکنے کے بعد نئے تازہ پھول اس میں سجادیئے۔اس کے بعد لڑکی ایک ادائے دلربا کے ساتھ مڑی اور مہمان پر اچٹتی نگاہ ڈال کر واپس چلی گئی۔

انورعلی کو ایسا لگا گویا وہ اس کا دل نکال کر لے گئی ہے۔

''ہائے!''بے ساختہ اس کے منہ سے آواز دیر تک کمرے میں گونجتی رہی۔ایسی بات ہرگز نہ تھی کہ انورعلی نے پہلی بار کسی خوبصورت نازک اندام لڑکی کی رسیلی زبان سے گڈ مارننگ سنا ہو۔البتہ اسکی مدبھری آواز نے اُسے ایسی دنیا میں پہنچا دیا جہاں وہ ٹریول ایجنسی کا معمولی ملازم نہیں بلکہ ایک علیٰ پائے کا امیر ترین ٹوشاعری کے تقدس کی طرح اس کے دل ودماغ رسٹ ہو۔اگرچہ اسکی زندگی میں اس سے پہلے کئی لڑکیاں آئی تھیں۔کئی حسیناؤں سے تنہائی میں گفتگو بھی کی تھی مگر ایسی حسین صورت کو دیکھنے کا تجربہ آج ہی ہوا تھا۔مگر کوئی انجانی کشش روکے رہی۔وہ للہٰ عارفہ کی روحانی پر حاوی ہوگئی۔سچ مچ وہ ایک لمحے میں اس کا دل نکال کر لے گئی تھی۔

اس نے معلوم کرلیا کہ لڑکی کا نام غزالہ ہے۔ہاوس بوٹ کے مالک عبدالصمد کی دور کی رشتہ دار ہے۔پڑوس کے محلے میں رہتی ہے۔اور صبح سویرے پھولوں کے گل دستے لے کر ہاوس بوٹ میں سیلانیوں کو پیش کرکے بخشیش وصول کرتی رہتی ہے۔یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔

اتنا جان کر انورعلی نے مزید کچھ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔البتہ ہاؤس بوٹ میں قیام کرنا۔رات کو غزالہ کے خیالوں میں مسحور رہنا اور صبح پھولوں کا گلدستہ لے کر گڈ مارننگ سننا اس کے بس میں نہ تھا۔کیونکہ یہ ساری کارروائی شکوک پیدا کرسکتی تھی۔اور یہ شکوک آگے بڑھ کر نہ جانے کون سارخ اختیار کرلیتے۔البتہ دل کے ہاتھوں مجبور انورعلی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بےتاب تڑپ

محسوس کرتا تو خیالی جھیل میں ضرور غوطہ زن ہو جاتا۔

ہر دم غزالہ اپنا کام بڑی خوش اسلوبی اور تندہی سے کیا کرتی اور صرف اس وقت نروس نظر آتی جب وہ انور علی کے غیر ضروری سوالوں کا جواب دینا نا مناسب سمجھ کر اسے ٹال دیا کرتی۔ البتہ خالی خالی نظروں سے دیکھتی ضرور۔ یوں جیسے ان آنکھوں میں پتلیوں کی بجائے کانچ کے ٹکڑے بھرے ہوں۔ انور علی کو اس ردِ عمل کی بالکل توقع نہ تھی۔ اس نے اپنی طرف سے التفات بڑھانے کے بہت سے نسخے آزمائے مگر وہ نہ صرف کوئی اثر قبول کرنے سے کترائی بلکہ اس کے بدن سے برف کی سل کی طرح چھو کر بھی نکل گئی۔

حاجی عبدالصمد سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے انور علی کی بے قراری جان لی اور سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جولڑکی پھولوں کے گل دستے بیچ کر بخشش لینے سیلانیوں کے سامنے آتی ہے یہ اس کی ضرورت ہے اور مجبوری بھی۔ اس کو غلط سمجھنا یا اس کے ساتھ راہ رسم بڑھانا عبث ہے ۔جواب میں انور علی کچھ نہ کہہ سکا۔

اس دوران انور علی اپنے ٹور شیڈول کے مطابق بخوبی کام سرانجام دیتا رہا۔ ساتھ ہی اسکا ذہن غزالہ کی فکر میں بھی ڈوبا رہتا۔ فکر اس لئے کہ ایک طرف غزالہ اس کے نس نس میں سما چکی تھی۔ تو دوسری جانب اماں کی پسند یعنی نسرین آڑے آکر خدشات پیدا کر رہی تھی۔ اُسے ہر پل ہر لمحہ ہر نظر اور ہر شئے میں غزالہ کا مکھڑا دکھائی دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ مسلہ کیسے سلجھایا جائے۔ پھر اُس نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اُسے اپنی بات منوا کر راضی کر لے گا۔

اس رات اسکی آنکھوں سے نیند اُڑی اُڑی رہی...... اُسے لگا جیسے تاروں بھری رات میں سارے بیتے لمحے قطار در قطار کھڑے ہوں۔ مگر ان کے پیچھے اماں نسرین کا ہاتھ تھامے کھڑی شادی کرنے پر مصر ہو۔

دوسری صبح انور علی کی روانگی یقینی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک غزالہ نے خود میز پر ظہرانہ سجایا۔ شاید ویٹر کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ انور علی کو گفتگو کا ایک اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ وہ دبے پاؤں اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور پھر نہایت متانت سے اپنا حال دل سنا کر اپنے نئے عزم کا اظہار کر لیا۔

غزالہ بوری بڑی سنجیدگی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ کسی تذبذب کا شکار نہ ہوئی کہ

دائیں بائیں ایک قدم ہٹ جاتی یا وہاں سے بھاگ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اس کے ٹھہرنے کا آخری دن ہے۔ جب انور علی کے آتش فشاں کا دہانہ خاموش ہوگیا۔ تو بڑی نرمی اور حلاوت سے بولی۔

''میری اور میری جیسی دوسری لڑکیاں جو صبح سویرے شنکرآچاریہ کی پہاڑی سے یہاں ہاؤس بوٹوں میں گلدستے لاکر سیلانیوں سے اس کی قیمت لیتی ہیں یہ قیمت صرف ان پھولوں کی ہوتی ہے۔ چاہے کتنی بھی ہو۔ پھول والی کی نہیں۔ کیونکہ پھول والی نہ دل دیتی ہے نہ دل لیتی ہے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔۔ غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہونے والا ہی نظروں میں کم ظرف اور نادان ہے۔ پھولوں کے بدلے کانٹے دینے والوں کی ہمیں خوب پہچان ہے اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا بھی ہم خوب جانتے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ اپنی برادری سے باہر پرایا مرد ہماری زندگی میں نہیں آسکتا۔ ہماری سوچیں جھیل کے نیلے پانی کی طرح صاف اور شفاف ہیں۔ چند سال پہلے ایک انجان شخص نے اس پوتر جھیل کو ناپاک کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے میرے بھائی گل خان نے مار ڈالا۔ گل خان میرا بھائی تحریک آزادی کا سرغنہ تھا۔ پانچ سال پہلے ایک مائن بلاسٹ میں شہید ہوگیا اور اس جیسا آج تک کوئی پیدا نہ ہوا۔''

اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں کے پلکوں سے آنسو پھسل کر چہرے پر پھیل گئے۔

انور علی دیکھتا رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ سوچ بھی نہ سکا۔

..................☆☆☆..................

آئندہ نیا افسانوی مجموعہ

''کلی کی بے کلی''

پڑھنا نہ بھولیئے گا۔

دھوئیں کی تحریر

مشرق کی جانب سے سورج نکلتا............
تو اس کی ہلکی ہلکی کرنیں کمرے میں بلا خوف گھس پڑتیں اور اسکی آنکھوں پر اپنا تسلط جما کر ستانے میں لگی رہتیں اور اُسے طلسمی خوابوں کی دنیا سے واپس لانے پر زور پکڑ لیتی۔

برسوں سے رام سروپ کو جس کی تلاش تھی۔ شاید اسکی وہ پری کہیں آسمان کی وسعتوں میں یا اساطیری کتھاؤں یا حکایتوں میں چھپی تھی۔ وہ اُسے آواز دے کر بلانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔

دیر تک اس کا انتظار کر کے جب وہ تھک جاتا۔ اس کے بدن میں مایوسی کی ایک تیز لہر دوڑتی چلی جاتی خون میں ابال آجاتا تو آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آتیں۔ ماتھے پر رگیں سکڑ جاتیں تو اس کے سانسوں کے زیر و بم میں انتشار بڑھنے لگتا تھا۔ دل میں کوئی چھپا ہوا درد اُسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا...... وہ آنکھیں بند کر کے اپنے اندر ہی اندر کہیں دُور چلا جاتا۔ کافی دیر بعد جب وہ اپنی آنکھیں کھولتا۔ ایک ٹک چھت کو تکتا رہتا تو اپنے آپ سے بڑبڑانے لگتا۔

"کیا پیٹ بھر لینا ہی زندگی ہے اور پھر اس بے مقصد جدوجہد کرنے میں کونسی عقلمندی ہے۔"

دیر تک جب اُسے کوئی جواب مل نہیں پاتا تو وہ چپ ہو جاتا...... رام سروپ اکثر دکھی اور اداس رہتا۔ شاید وہ زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا ہو تھا۔ اور اُسے زندگی کی تمام خوشیاں بے لطف محسوس ہو رہی تھیں۔

سورج کی کرنیں جب کمرے میں بے ہنگم رقص کرنے لگتیں تو وہ چونک جاتا تھا۔ بستر چھوڑ کر کھڑے ہو کر ایک جماہی لے کر اپنے آپ سے کہتا۔

"اے میری جان! اب تو ہاتھ منہ دھو لے۔ دیکھ سورج کب کا نکل آیا ہے۔"

نازک کرنوں میں پتہ نہیں کیا جادو تھا۔ وہ فوراً ہاتھ منہ دھو لیتا اور کبھی کبھی نہایا بھی کرتا تھا۔

پاپی پیٹ کا سوال تھا اور تھوڑا سا ناشتہ کرنا ضروری تھا۔ گھر سے پاس والی گلی میں چائے کی دکان پر چلا جاتا اور وہاں سے کام پر نکل پڑتا تھا۔

شام کو کام سے فارغ ہو کر تھکا تھکا سا نڈھال اور بوجھل پن محسوس کر لیتا تو سورج غروب ہوتے ہی وہ لوٹ کر گھر آ جاتا تھا۔ لوٹتے وقت بس اڈہ پار کر کے اُسے انار کلی مارکیٹ میں پہلے اس گلی سے گزر جانا پڑتا تھا۔ جہاں نکڑ پر مدتوں سے چلی آ رہی ایک دیسی شراب کی دکان تھی۔ جس کا مالک سنت رام نامی ایک بدقماش آدمی تھا اس سے مڈ بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ شاید وہ اس کا دور کا رشتہ دار تھا۔ کبھی وہ سنت رام کو بیوی اور بچوں کے متعلق پوچھا کرتا تھا۔

سنت رام صبح دس بجے پابندی کے ساتھ دکان کھولتا اور رات کے گیارہ بجے بند کر دیتا تھا۔ ہر وقت ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں اور آوارہ گرد نوجوانوں کا وہاں رش لگا رہتا تھا۔ ساتھ ساتھ رکشا پردی کاغذ گتے جمع کرنے والے اور جھاڑ دیچنے والے غریب لوگ بھی ان میں شامل ہوتے تھے۔ جو دن بھر کی خون کی کمائی شراب پر لٹاتے رہتے۔ اور دال روٹی دمونگ پھلی کھا کر اپنی بھوک مٹاتے رہتے۔

شام کو کئی بدمست شرابی دکان کے اندر شور و شرابہ اور ہنگامے برپا کیا کرتے۔ کبھی کبھی گالی گلوچ کرتے یہاں تک کہ ہاتھا پائی پر بھی اتر آتے تھے لیکن سنت رام کی معمولی ڈانٹ پر خاموش ہو جاتے...... آوارہ گرد لوگوں کو دن بھر کی تھکان دُور کرنے کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔ شراب کے چند گھونٹ پینا اور گپ شپ جس سے وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ کسی بھی حالت میں کھونا نہیں چاہتے......

راستے میں چلتے چلتے رام سروپ کے قدم اچانک دکان کے سامنے رک جاتے اور پھر بلا تا خیر وہ دکان کے اندر چلا جاتا۔ شراب کی بوتل منگوا کر کھڑے کھڑے پوری بوتل نہ سہی، آدھی ضرور اپنے حلق کے نیچے انڈیل لیتا اور باقی آدھی بوتل بچا کر اپنی پتلون میں منوہر جوتشی کے لئے سنبھال کر رکھ دیتا ۔جس سے وہ یارانہ گانٹھ چکا تھا۔ رات کو خرگوش کی نیند سونے تک اپنا دکھڑا سنایا کرتا تھا۔ ورنہ بناء پئے ہی سو کر دوسرے دن اسکی طبیعت اچاٹ رہنے لگتی تھی۔ کسی حد تک یہ تو منوہر جوتشی کے لئے مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ہے کرنے والی بات تھی۔ اسکی الم غلم باتیں سننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بے بس اور لاچار تھا۔ انکار کرنے کی صورت میں اُسے گھر سے بے گھر ہونے کا خدشہ لاحق رہتا۔

نشے کی حالت میں رام سروپ کو اپنے ارد گرد سب کچھ ہلتا اور ڈولتا محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھتا اور لوگوں کے خلاف الٹا پلٹا بکتا [illegible] بستی [illegible] کئی بار لوگوں نے

زیادہ شراب پینے پر لعنت، ملامت کی تھی اور اعتراض بھی اٹھایا کہ وہ بے وجہ بہو بیٹیوں کو گالیاں دیتا ہے اور تنگ کرتا رہتا ہے۔ اُسکی ایسی حرکتوں پر روک لگانے کی ہزار ہا کوشش کی گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ کہتے ہیں نا۔ کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

رام سروپ کو لوگوں سے یہی شکایت تھی کہ انہوں نے کبھی اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور نہ زخموں پر مرہم لگانے کی سوچی۔ اس لئے اس نے شراب کا سہارا لیا اور اپنے تمام غموں سے نجات پانے کا بہانہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ جب سے اسکے گھر میں منوہر جوتشی نے اپنا قدم رکھا تھا اس نے آہستہ آہستہ زندگی کا وطیرہ بدلا تھا۔

ایک عرصہ پہلے منوہر جوتشی اپنے گاؤں میں اپنی پتنی شانتا دیوی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچوں اور بہن کملا کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں انہیں چھوڑ کر وہ کسی کام دھندے کی تلاش میں شہر آ گیا تھا۔ تھوڑا بہت لکھا پڑھا اور شاطرانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اس کے پاس جو چند کنال زمین تھی۔ وہ خشک سالی کی وجہ سے سوکھی اور بنجر پڑی تھی۔ چونکہ گاؤں میں ذرائع آمدنی محدود تھے اور اسکی آمدنی بھی اتنی قلیل تھی۔ جس نے اسکی راتوں کی نیند حرام کردی تھی۔ ادھر بہن کملا اب جوان ہو چکی تھی۔ دور دراز گاؤں میں اسکی شادی کی بات چل رہی تھی۔ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کا تقاضہ بڑھ رہا تھا۔ ان سب کو پورا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُسے مجبوراً شہر کا رخ کرنا پڑا اور شانتا دیوی سے اپنی زبان دیکر وداع ہو گیا تھا کہ ہفتہ بھر کی کمائی وہ پابندگی کے ساتھ منی آڈر کے ذریعے روانہ کرتا رہے گا۔ بہن کی شادی اس کے لئے سوہان روح بن چکی تھی۔

شہر آکر منوہر جوتشی کو پہلے سر چھپانے کے لئے تھوڑی سی جگہ کی ضرورت تھی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ سب سے پہلے رام سروپ سے اسکی پہلی ملاقات ہوئی۔ چلتی گاڑی میں منوہر جوتشی نے ایک فرضی کہانی سنائی تو اِس کا دل فوراً پسیج گیا۔ چونکہ رام سروپ پہلے سے ہی تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ ہاتھ کو کنگن کی آرسی کیا کے مصداق اُسے ایک ساتھی مل گیا۔ جو اسکی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔

منوہر جوتشی کو اپنا دوست بنا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ رہنے کے لئے نہ صرف جگہ فراہم کی۔ سونے کے واسطے پورا انتظام و بندوبست کرنے کے لئے بازار سے ایک پرانی چارپائی بھی منگوا کر اپنے کمرے میں ہی بچھائی تھی۔ اوڑھنے کے لئے ایک سستی سی کمبل بھی خریدی تھی اس طرح بڑی آسانی سے منوہر جوتشی کو رام سروپ کی چھت کے نیچے پناہ میسر بنا لینے میں کامیابی نصیب ہو گئی۔ بے فکر

اور آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو خط میں ساری باتوں سے آگاہ کر دیا کہ اب وہ رات کو بے فکر اپنا سر چھپا سکتا ہے اور دن بھر کام پر بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اُسے دیر رات تک رام سروٗپ کی بک بک سننا گوارہ کرنا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ نشہ کرنے اور جاگنے کا عادی ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ وہ دونوں چار پائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رام سروٗپ اپنی پچھلی زندگی کے متعلق یکے بعد دیگرے انکشاف کئے جا رہا تھا اور منوہر جوتشی نہایت دلچسپی سے اسکی باتیں سنتا رہا۔ جسے سن کر منوہر جوتشی کو دکھ ہوا اور یہ جان گیا کہ زندگی میں رام سروٗپ کو کئی مصیبتوں، الجھنوں اور پریشانیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ قدم قدم پر شناساؤں نے ستایا ہے اور اسے دکھ دیا ہے۔ اب کسی پر بھی بھروسہ کر پانا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔

منوہر جوتشی کو جب یہ معلوم پڑا کہ ایک عرصے سے رام سروٗپ کو ایک جیون ساتھی کی تلاش تھی۔ دوسرے انسانوں کی طرح شادی کر کے زندگی بسر کرنے اور اپنا الگ ایک گھر بسانا چاہتا تھا لیکن وہ ان سب سہولتوں اور مراعتوں سے محروم تھا۔ بستی میں اُسے آج تک کوئی ایسی لڑکی نہ ملی اور نہ ہی کسی نے منہ لگایا تھا۔ کئی بار اس نے بڑی عمر کی لڑکیوں کو شادی کا پیغام بھجوایا اور منہ مانگی رقم کا لالچ بھی دیا مگر اسکی ہر پیشکش ٹھکرائی جاتی تھی۔ بدلے میں اُسے نکما اور کاہل جیسے خطابوں سے نوازا جاتا تھا۔ عورتوں میں اکثر اسکی آوارہ گردی کی کہانیاں اڑتی رہتیں۔ اسی بناء پر کوئی بیاہ رچانے کے لئے تیار نہیں ہو رہی تھی۔

رام سروٗپ کی اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب وہ کسی عورت کو دیکھتا۔ دکھے دل کے ساتھ نامحرومی کا درد سینے میں اتنا بڑھ جاتا کہ پوری پوری رات آنکھوں آنکھوں میں گزار لیتا تھا اور زخمی پرندہ کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔ نجانے وہ کیا کر بیٹھتا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ عورت ذات سے نفرت کی حد تک بیزار ہو گیا۔

جیسے تیسے وقت گزرتا گیا۔ منوہر جوتشی اُسے اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے دل میں نئے سرے سے محبت کا بیج بویا اور شادی کرنے پر راضی کر لیا۔ اس نے شہر سے دُور جا کر اپنی بیوی شانتا دیوی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے ہی رام سروپ کے بارے میں سب بتا چکا تھا۔ گاؤں کی کوئی بھولی سی لڑکی دیکھنے اور آمادہ کرنے کے لئے زور دیتا رہا۔

چند ہفتوں کے بعد شانتا دیوی کا خط آیا لکھا تھا کہ اُس نے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے جو جوان

ہے اور نہ بوڑھی۔ درمیانی عمر ہے یہی کوئی چالیس سال کی ہوگی۔ لڑکی والوں نے پندرہ بیس ہزار روپے بصورت نقدی ادائیگی کی شرط رکھی۔

رام سروپ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرنے کے حق میں تھا۔ اس نے فوراً ہاں کردی۔ دیر کس بات کی تھی۔ معاہدہ طے ہوا اور اگلے دو مہینوں کے اختتام پر شادی رچانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس دوران شانتا دیوی کے دو تین خطوط آگئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر وہ جھوم اٹھتا اور چومتا رہتا...... سینے سے لگا لیتا تھا۔ جیسے محبوب پالینے کی امید دل کے تسکین کا باعث بنتی ہو۔ اس نے شراب نوشی سے توبہ کی۔ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے ہر طرف حوریں ہی حوریں اب نظر آتی تھیں اور کانوں میں شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیتی تھی۔

شام ڈھلتے ہی وہ اب سیدھا اپنے گھر کا رخ کر لیتا تھا۔ شراب کا نام سن کر اسکے ماتھے پر بل پڑتے اور پینے والوں کو بُرا بھلا کہنے لگتا تھا۔ اس نے نہ صرف جینے کا انداز بدل دیا تھا جبکہ اپنا سارا حلیہ ہی یکسر تبدیل کروایا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اب وہ چالیس کا لگتا تھا۔ جسمانی طور پر مضبوط تھا ہی۔ سر کے بالوں میں جہاں سفید بال اُگ آئے تھے وہاں خضاب لگا کر کالے نظر آنے لگے۔ کرتہ پاجامہ کی جگہ چُست پتلون اور ریڈی میڈ شرٹ کی بناء پر کوئی اسے بوڑھا یا بزرگ کہہ نہیں سکتا تھا۔ غرض اپنی شخصیت دلکش بنانے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔

لگ بھگ ڈیڑھ مہینہ یوں گزرا۔ جیسے کسی پیڑ کی ٹہنی پر کوئی کوا کائیں کائیں کرتا اڑا ہو۔ رام سروپ نے رات دن محنت کے بعد ایک ایک پائی جوڑ کر تقریباً بارہ ہزار روپے اکٹھے کر لئے تھے۔ صرف تین ہزار روپے کی کمی رہ گئی تھی۔ جسے پورا کرنے کے لئے اس نے سنت رام سے روپیہ یوں سود پر حاصل کیا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ رام سروپ نے اپنی جمع کردہ ساری پونجی منوہر جوتشی کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اور اُسے گاؤں جانے یا شانتا دیوی کو خط لکھنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ برسوں سے وہ جو خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب وہ کافی اُتالا وا اور بے تاب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''منوہر بھائی۔ اب تو ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں میری مانو! تم کل گاؤں چلے جاؤ۔''

''مجھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بھئی ذرا سوچو۔ بھابی اگر خوش تو پانچواں انگلیاں گھی میں۔'' منوہر جوتشی نے اسکے سوال کا پہیلی کی طرح جواب دیا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا......آخرتم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' رام سروپ سپاٹ لہجہ میں پوچھنے لگا۔

''میں جو بات کہوں گا وہ تیرے بھلے کی ہوگی۔ ابھی نازک رشتہ ہے..........'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

''بھئی صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''میں اپنی کیا کہوں۔ سماج اور دستور کے مطابق دلہن کے لئے دو تین جوڑے کپڑے سلوانے پڑیں گے۔ چند ہلکے پھلکے زیورات سونے کے نہیں تو چاندی کے بنوانے پڑیں گے۔ شادی میں اپنے پرائے سب ہوتے ہیں اور پیٹھ پیچھے برائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو منہ چڑاھنے میں دیر نہیں کرتے۔ پھر جب عزت کا سوال ہو۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

منوہر جوتشی اسے جوتشی کی طرح سمجھاتا رہا۔

''پہلے یہ بات کیوں نہ بتائی۔''......رام سروپ الجھن میں پڑ گیا۔ اُسے دن میں ہی تارے نظر آنے لگے۔

''اس کا خیال نہیں رہا۔'' بڑی معصومیت سے منوہر جوتشی نے جواب دیا۔'' آج صبح شانتا کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی۔ دلہن کے لئے سسرال کے کپڑے اور زیورات پہن لینا اچھا شگون رہتا ہے۔''

''کیا سنت رام مزید قرضہ دینے پر تیار ہوگا۔'' رام سروپ بہت پریشان ہوا۔ بڑے دکھ سے بولا۔

''کیوں نہیں دے گا سالا۔ اُسے بیاج کے ساتھ غرض ہے۔'' منوہر نے دلاسہ دیا۔

دوسرے دن رام سروپ نے سنت رام کے پیر پکڑ کر مزید پانچ ہزار روپے ادھار لیے ۔ پھر دونوں نے اکٹھے دو تین درمیانہ قسم کے کپڑے خرید کر سلوانے دیئے اور سُنار کو چاندی کا جھمکا۔ انگوٹھی اور ٹاپس کا آرڈر دیا۔ کام نپٹا کر رام سروپ کام پر چلا گیا جبکہ منوہر جوتشی پاس ہی ایک ڈاک خانہ میں منی آرڈر بنانے کے لئے چلا گیا۔

آخری وہ دن بھی آگیا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ کپڑے اور گہنے تیار ہو گئے تھے اب صرف دلہے مہاراجے کو براتیوں کے ساتھ سسرال جانے کی دیر تھی۔ تین دن بعد شادی کی رسم پوری ہونی تھی۔ منوہر جوتشی نے جب یہ دیکھا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا تو اگلے دن گاؤں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

اُس روز اس نے سورج نکلتے ہی سب چیزیں ایک اٹیچی میں بڑے سلیقے سے رکھ دیں۔ اتنے میں آٹھ بجے نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ رام سروپ اُسے رکشا میں بٹھا کر بس اڈہ تک چھوڑنے آ گیا تھا۔ چھوڑتے وقت وہ منوہر جوتشی سے بڑی گرمجوشی میں بولا اور بار بار تاکید کرتا رہا تھا۔

''منوہر بھئی۔ گاؤں پہنچ کر فوراً سنت رام کی دکان پر فون کر دینا۔ میں وہاں انتظار کروں گا۔ آٹھ دن کے اندر پنڈت جی سے شادی کا مہورت اور شبھ گھڑی نکال لینا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔''

''میرے بھولے ناتھ، کاہے کی فکر کرتے ہو۔ یہ سارا کام شانتا نے خود کیا ہو گا۔ اس معاملے میں مجھ سے بہتر جانتی ہے وہ...... پانچ سال تک کسی برہمن کے گھر میں کام کرتی رہی ہے اور ابھی کنواری ہی تھی۔'' منوہر جوتشی نے ایک دبا دبا سا قہقہہ لگایا اور اسکے دائیں شانہ کو تھپتھپانے لگا تھا۔

''پھر بھی مجھے فکر ہو رہی ہے۔ نجانے کیوں میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔'' رام سروپ نے اپنی بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''بس اب تم اس بات کی فکر کرو کہ کب اپنے سر پر سہرا سجاوٴ گے۔'' ...... منوہر جوتشی نے پورا دلاسہ دیا اور اسکے سینے کے ساتھ لگ گیا۔ خوشی سے اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کی تری دکھائی دینے لگی۔ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ادھر رام سروپ آسمان تلے خوشی سے جھومتا رہا۔ اُسے ہر طرف ذرّہ ذرّہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا اور ان مسکراتے چہروں میں کسی نسوانی چہرہ کی صورت دکھائی پڑتی۔ اپنی آنکھ دبا کر وہ موج و مستی اور رنگ رلیاں منانے پر اُکسا دیتی ہو جیسے۔

منوہر جوتشی ہاتھ میں اٹیچی لیکے نمستے کہہ کر تھوڑا سا جھکا اور بس اڈہ کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

رام سروپ اُسے دور تک دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اسکی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک......دو......تین......!

ایک ایک کر کے تین دن گزر گئے۔ آخر اسکی اُمید نے دم توڑ دیا۔ اسکے خواب جیسے بکھر گئے۔ نفرت کی منحوس لہر سارے وجود میں سرائیت کر گئی تھی۔ ساری راتیں جاگتے جاگتے اور دن انتظار کرتے کرتے وہ خاموشی کا تلخ گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

اس دوران اس نے سنت رام کی دکان پر کئی چکر کاٹے مگر ہر بار اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا

۔ہر پل ہر لمحہ اسکی بے چینی و بے قراری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اب وہ تھک چکا تھا اور ٹوٹنے لگا تھا۔
وہ اپنی قسمت پر روتا رہا اور کبھی اُسے اپنے پاگل پن پر ہنسی آنے لگتی تھی......!
''ارے پاگل ۔تم نے ایک اجنبی پر بھروسہ کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔جس کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔اب تم بُری طرح پھنس گئے ہو۔'' وہ بڑبڑاتا رہتا اور منوہر جوتشی کو گالیاں دیتا رہا۔
''سالا بڑا دغاباز نکلا کہ مجھے کہیں کا نہ رکھا۔سامنے آتا تو اس کمینے کا منہ نوچ لیتا۔''
سنت رام نے اسکی حالت دیکھی تو رام سروپ کی ہمت بندھائی اور دلاسہ دیتا رہا اور کبھی کبھی منوہر جوتشی کو اسکی حرکت پر گالیوں سے نوازتا رہا۔
ایک ہفتہ گزرا جیسے وہ کانٹوں کے بستر پر سویا ہو۔
پھر ایک دن جب آسمان بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔رام سروپ چارپائی پر دُبک کر کسی گہری سوچ مٰیں ڈوبا ہوا تھا۔دنیا و مافیہا سے بے خبر......اچانک وہ چونک پڑا۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا اور بار بار رام سروپ کا نام لے رہا تھا۔
وہ اٹھا اور دروازہ کی طرف بڑھا۔دروازہ کھولا تو ایک ادھیڑ سالونی عورت اسکے سامنے کھڑی تھی۔وہ بڑی معصومیت سے اُسے دیکھے جارہی تھی۔رام سروپ تجسس اور تذبذب کا شکار سر سے پاؤ ں تک اس کا جائزہ لیتا رہا اور وہ دم بخود ہو کر رہ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے پوچھا۔ جیسے اُسکے الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔
''کون ہو تم اور کس سے ملنا چاہتی ہو۔؟''
''تم رام سروپ ہونا۔ مجھے شانتا دیوی نے یہاں بھیجا ہے جو منوہر جوتشی کی دھرم پتنی ہے۔''
یہ کہتے ہوئے وہ اجنبی عورت ایک دو قدم آگے بڑھی۔وہ اسکے اسقدر قریب آگئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے دل کی دھڑکن صاف سن سکتے تھے۔اس نے فاتحانہ انداز میں یوں قدم بڑھایا کہ رام سروپ کو اسکے ایک ٹانگ کے لنگڑے پن کا احساس ہونے لگا اور وہ جلد ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔اس عورت نے چوکھٹ سے اپنی کمر لگائی اور اس کا بدن دو حصوں میں بٹ کر آدھا اندار و باہر رہ گیا۔شاید اُسے ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔وہ بھاری جسم کی عورت تھی رام سروپ کے آگے کوئی چٹان آ کھڑی ہوئی۔
''تم کس سلسلے میں یہاں آئی ہو۔کیا اُس نے کوئی پیغام بھجوایا ہے۔''
''ذرا دم سنبھال لینے دو۔سب کچھ بتاؤں گی۔پھر کچھ توقف کے وہ دوبارہ بولی۔ایک مہینہ

سے شانتا دیوی میرے پیچھے پڑی تھی۔ وہ ہفتے میں دو بار مجھ سے ملنے آتی تھی۔ کل آ کر اس نے پانچ سو روپے بس کرایہ اور تمہارا پتہ دیا۔ بڑی منّت وسماجت کے بعد مجھے شادی کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ ورنہ میں کالی داس مندر میں ایک عرصہ سے داسی بنکر رہ رہی تھی شادی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" .... یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کمر جھکائی اور آشیرواد کے انداز میں اپنا ہاتھ رام سروپ کے پیروں کی طرف بڑھایا۔ یہ دیکھ کر رام سروپ ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ رام سروپ کے پیر چھوتی۔ اس نے عورت کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور اپنے سینے سے لگائے۔ اس لمحہ شناسی میں عورت کا چہرہ رام سروپ کی آنکھوں میں گھوم گیا اور وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ دور کہیں آسمان پر بادلوں کے گرجنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔

چند لمحوں کی قرابت رام سروپ کو کیا حاصل ہوئی کہ ہاتھوں میں ہاتھ تھامے اس کے لمس سے بدن میں حرارت اور حرکت آ گئی تھی اور بے رونق زندگی میں بہار آ گئی تھی۔ وہ اسکی بے کیف زندگی میں پھولوں کی خوشبو اور تتلیوں کے پَرا کر رنگ بھرنے آ گئی تھی۔ ایک خدمت گار بن کر زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے اسکے دل کے دروازے پر دستک رہی تھی...... وہ اس موقع کو کیسے اپنے ہاتھ سے جانے دیتا کیونکہ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اسکے اندر کے مرد نے کیا سوچا کہ وہ گھبرا سا گیا اور خوفزدہ ہو کر کسی سخت کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اچانک اس نے اپنے خوابوں کا محل چکنا چور ہوتے دیکھا اور کمرے میں بدنامی سر سراتی چیختی اور چنگھاڑتی دوڑتی چلی آ رہی محسوس کی۔ وہ مزید کوئی خطرہ یا رسوائی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے سوچوں کے دائروں میں پھنس کر رہ گیا...... لیکن ہاتھ آئی ہرنی کو یونہی کیسے جانے دیتا۔ باہر کالی گھٹا اور برکھا میں تنہا اکیلی عورت کہاں کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے۔ رات گہری اور تاریک تھی۔ راستے میں اُسے کہیں بھی کوئی کتا کاٹ سکتا تھا۔

دیر تک وہ انہی خیالوں میں پگھلتا رہا۔ گرم اور سرد دھواں سا فضا میں تحلیل ہوتا رہا۔ کوئی فیصلہ کر نہیں پا رہا تھا...... یک لخت اچانک کمرے میں اُسے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ وہ بڑبڑاتا رہا۔

"سالی رات کافی گزری ہے اور میں بازار سے کھانے کے لیے کچھ لانا بھول گیا۔"

دور گلی میں اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا......!!!

☆☆☆

""شیشے کی دیوار......""

شام اتر رہی تھی۔ اور بڑھتی تاریکی میں ہر شے دھندلی سی نظر آنے لگی تھی۔ کافی دیر سے وہ برآمدے میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو اپنے کمرے میں چلی آئی اور بجلی آن کر دی۔ سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ سامنے میز پر طشتری سے ڈھکا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹ حلق کے نیچے اُتار دیا۔ اتنے میں دیوار پر لگے گھڑیال نے دس کا گھنٹہ بجا دیا۔

وہ کافی نروس لگ رہی تھی۔ ہر پل ہر لمحہ ہر گھڑی اس کی نس نس میں بے چینی و بے قراری کی آندھی بڑے زوروں پر چلتی رہی اور اُس سے پیدا شدہ اثرات اسکے چہرے پر صاف نمایاں ہوتے رہے۔ جانے والا! کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔

اچانک اس کی خشم آلود نگاہیں کھڑکی کے شیشوں سے پار باہر گیٹ کے عین سامنے ایک ایسے اسکوٹر سوار پر پڑی۔ جس کے پیچھے بیٹھی کوئی سواری جلدی میں نیچے اتری۔ دونوں عجلت میں تھے۔ اسکوٹر سوار نے اُسکا بوسہ لیا اور اسکوٹر بڑھا کر دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ سرکاری کھمبے کے بلب میں اُن کی شناخت کرنا اِسکی دسترس سے باہر تھا۔

دُور اندھیرے میں ایک سیاہ ہیولا گیٹ کے اندر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھتا چلا آیا۔ اُس نے فوراً اندازہ لگایا کہ بیٹی کملا ہو گی۔ آنے والی برآمدے میں پہنچی تو اس کا اندازہ صحیح نکلا وہ بے تحاشہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

""مما۔ آئی ایم سوری۔"" کملا نے اپنی ماں کے چہرے پر بگڑتے تیور دیکھے تو نہایت حلیمی سے اپنی صفائی میں دلیل دی۔ ""ٹریفک جام سے لیٹ ہو گئی""۔

""سوری کی بچی کہاں مری تھی۔ یہ کوئی گھر آنے کا وقت ہے؟""

""جانے دو غصے کو۔ اب ایسا دوبارہ نہ ہوگا""۔ کملا لاپروائی کے انداز میں بولی اور کپڑے تبدیل کرنے کے لئے سامنے وارڈروب کی جانب بڑھی۔ شانتی دیوی نے ٹوک کر رکنے کا اشارہ کیا۔

ماں آزاد خیال تھی تبھی تولاڈلی کملا اُس کا ناجایز فایدہ اٹھا کر کافی بگڑ چکی تھی۔اس کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھی۔

اس پر شانتی دیوی آپے سے باہر ہوئی۔آنکھوں کی پتلیوں میں غصے سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور وہ کسی بھپری شیرنی کی طرح اُس پر جھپٹ پڑی۔

''رُوز کی طرح آج بھی کوئی نیا بہانہ تراشا ہے۔اکثر شیلاؔ۔نرملاؔ۔رضیہ اور امرتاؔ کے ساتھ کسی فلم پارٹی یا پکنک میں ہونے کی باتیں کرتی رہتی ہو''۔پھر ذرا توقف کرتی ہوئی بولی۔''اُس نئے لنگور دوست کیساتھ کہاں کہاں گل چھرّے اُڑاتی پھری رہی ہو؟

مارے غصّے کے ماں کے منہ میں جو بھی کچھ آیا بے تحاشہ بیٹی کے منہ پر اگل دیا۔

یک لخت کملاؔ کا اچھا خاصا موڈ خراب ہوگیا۔شانتیؔ دیوی کی بات برداشت نہ کر پائی۔اسکی بات پر جیسے سارے شریر میں آگ لگ گئی۔جل بھن کر اپنی ماں کی نقل اتاری اور آگ بگولہ لہجہ میں بولی۔

''ماں!تم سے ایسی بات کی بالکل توقع نہ تھی۔بچپن کے بعد جب سے میں نے ہوش سنبھالا تم کو اکثر کہتے سنا۔ان سے ملو یہ تمہارے گریش انکل ہیں۔یہ تمہارے سکسینہ،رمیش اور یہ تمہارے اسلم انکل ہیں۔ہمیشہ اپنے نئے نئے دوستوں کا تعارف کراتی رہتی تھی یہاں تک کہ میں جوان ہوگئی اور خوب سمجھی کہ ان میں کوئی حقیقی انکل نہ تھا۔کیا خبر۔میرا باپ بھی مجھے جانتا ہوگا کہ نہیں۔جس لنگور کے متعلق پوچھ رہی ہو ناوہ کرتار سنگھ نامی سُنار کی پہلی بیوی کا لڑکا ہے۔نام ہے اجیت اقبال۔ایک بار میں نے اسکے باپ کو اسی گھر میں بیٹی کا نام لینے پر بے آبرو ہوتے دیکھا تھا۔تم اُسے دھکے مار مار کر نکال رہی تھی مما۔''

یہ سن کر شانتیؔ دیوی پر سکتہ طاری ہوگیا۔اور ذہن کے نہاں خانوں میں کرتار سنگھ کی جانی پہچانی شبیہ اُبھرتی بکھرتی محسوس ہوئی۔اُسے یاد آگیا کہ برسُوں پہلے وہ اس کے نام سے جڑی تھی اور اسکی مناسبت سے اعلیٰ درجے کی سوسائیٹی میں کافی شہرت پا چکی تھی!!!

..................☆☆☆..................

المیہ

جب شام رات کی بانہوں میں دبک جاتی۔ سکینہ تکان سے چور چور ہو جاتی۔ روز آکر بے حال۔ بوجھل اور نڈھال سی اپنے بستر پر دم سادے ساکت پڑی رہتی پھر نیند کی وادیوں میں اترتے ہی وہ سابقہ دنوں کی طرح عجیب وغریب خواب دیکھا کرتی۔ صبح ہوتی تو اُسے ذہن کے کینواس پر شب کے پھیکے پھیکے نقوش تیرتے ہوئے محسوس ہوتے۔

سکینہ مسلسل تین راتوں سے ایک ہی خواب دیکھ رہی تھی مگر آج اس نے ایسا انوکھا خواب دیکھا گو مماثلت اور مناسبت میں ایک جیسا ہو کر بھی اس کا آخری منظر سب سے الگ اور منفرد بالکل اس قدر ڈراونا سا تھا کہ خوف کے مارے اس کی چیخ خلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔

کمرے کی فضا غیر مانوس تھی۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر گہرے اندھیرے سے وحشت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا اس نے اپنی آنکھیں وا کر دیں۔ اُسے لگا کر وہ بخار سے تپ رہی ہے۔ ہرنی کی طرح اسکے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ اس کا ذہن ماوف ہو گیا۔

اتنا اُسے یاد ہے کہ وہ کسی شہزادی کی طرح ایک شکارے میں سوار ہوتی۔ اس کی شوخ نگاہ زبرون کے سفید اونچی اونچی چوٹیوں پر جا لگی رہتی۔ طائروں کی خوش نما بھانت بھانت کی بولیاں کانوں میں شہد گھولتی وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ دُور کہیں سے اڑتے اڑتے ایک کبوتروں کا جوڑا شکارہ کے اگلے سرے پر جا بیٹھا۔ بڑی دیر تک غرغوں میں مشغول رہتا۔ کبھی ایک دوسرے کا پیچھا کرتے کرتے شکارہ کے تکیہ تک اڑان بھرتے اور سامنے پڑے چاول کے دانے چگ چگ لیتے۔

اچانک اس نے دیکھا۔ آسمان سے ایک چمکتا تارا اس کے قریب آرہا ہے۔ جونہی وہ اس نورانی تارے کے قریب پہنچتی ہے یک لخت گھبرا کر اسکی آنکھ کھل جاتی ہے۔

آج اس وقت اسکی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت ایک عجیب سی نمی اتر آئی۔ جب اس

نے دیکھا۔ جیسے چاروں طرف بھیانک جنگل اُگ آئے، گھنگور اندھیرا سا چھا گیا۔ جھیل کی تھرتھری موجیں ٹھاٹھیں مارتے اٹھیں تو جیسے کوئی چیز اسکے اندر ٹوٹ پھوٹ کر اسے لہولہان کرگئی ہو۔ حیرت انگیز بات اس نے دیکھی۔ دور کہیں سے ایک بڑا ہیولا نظر آیا۔ روشنی یک لخت تیز ہوگئی۔ جیسے بجھتا ہوا چراغ بھڑکتا ہے۔ دفعتاً روشی نے کبوتروں کا جوڑا نگل لیا ہو پھر پلک جھپکتے ہی وہ اوجھل ہوگیا۔ تب دن کا تھکا ہوا سورج کا آتشین گولہ مغرب کی جانب ہاری پربت کی اونچی اونچی فصیل کے پیچھے غروب ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ رات کے اس تیسرے خواب سے اس کا دل دہل کر رہ گیا۔

کام سے فراغت ملتے ہی جب بھی وہ خالی الذہن رہتا، تو یہ بھیانک خواب پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اس نے گاؤں میں ایک متبرک خانقاہ پر جا کر کئی گشت لگا دیئے۔ مٹھی بھر بھر چاول فقراء اور مسکینوں میں تقسیم کرادی۔ اسکے سینے سے جیسے ایک پتھر ہٹ جاتا پھر بھی بوجھ بنا رہا۔ ایکا ایکی ربّ کا نام لیتے ہی آہستہ آہستہ خوف زائل ہوجاتا۔

فجر کی نماز سے ابھی نوری فارغ نہ ہوئی۔ ایک محویت کے عالم میں سکینہ نے دوبارہ خواب کا ذکر کیا۔ وہ بین بین کر کے روتی رہی اور اسکے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ماحول میں ایک نامعلوم سا بوجھل پن آگیا۔ جس نے نوری کے حواس گم کردیئے تھے۔ نس نس میں کچھاؤ سا آگیا تھا۔ اُسے آنکھوں میں دور دور تک پھیلا ہوا اندھیرا نظر آیا۔ باہر انگور کی بیل پر کوئی بھولی فاختہ گم صم بیٹھی کسی سوچ میں ڈوبی جانے آج کیوں وہ اپنی راگ الاپنا بھول چکی تھی۔

نوری نے صبح صبح سورج کی روپہلی کرن دیکھی۔ اچانک اُسے ایک بات سوجھی جس نے اسکی خرگوش جیسی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ دوڑی دوڑی وہ مسجد شریف کے احاطے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی۔ اپنے بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ مولوی صاحب! مولوی صاحب!" نوری نے صبح سویرے اسکے دروازے پر ہانک لگائی۔ مولوی صاحب تلاوت قرآن پاک چھوڑ کر باہر آئے۔ اس کے آنے پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر کیا نہ کوئی اعتراض کا اظہار کیا۔ اُسے بڑی عزّت کے ساتھ اپنے کتب خانے میں مسند کے قریب بٹھایا۔

نوری نے اس ڈراونے خواب کا ذکر کیا۔ اُسے دوگنا ہدیہ کا لالچ دیکر فال کھولنے پر راضی کرلیا اس نے ایک ایک بات کی وضاحت چاہی تھی۔

مولوی صاحب اسکی بات غور سے سنتے رہے پھر بسم اللہ پڑھکر کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر کے عربی کے کچھ لفظ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ دائیں بائیں اپنی گردن کے ساتھ ساتھ نظریں بھی گھمائیں۔ نوری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کتاب پر ایک لمبی پھونک ماری۔ گہری سوچ اپنے چہرے پر لاکر نہایت سنجیدگی سے سمجھاتے رہے۔

''نوری! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ جو جھیل ہے وہ رزق میں کشادگی کا مطلب سمجھ لے۔ چمکتا تارا کوئی نورانی فرشتہ تھا۔ پرندوں کی چہچاہٹ خوشی کی علامت ہے۔ اور شکارے کو زندگی جان لے۔''

پھر مولوی صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ بڑی دیر تک نوری کو اسکی خاموشی برداشت نہ ہوئی جھٹ بول پڑی۔

''مولوی صاحب۔ کبوتر کی جوڑی سے کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''کبوتر دیکھنا اچھا شگون ہے۔ اغلب اس بار تمہاری بہو کو ایک ساتھ جڑواں بچے ہوں گے مجھے کھلے اوصاف نظر آتے ہیں۔''

سچ مچ سکینہ کا پیر بھاری تھا۔ پہلے ہی اسکی گود میں ایک دو سالہ بچہ پل رہا تھا۔ مولوی صاحب کی یہ بات سنتے ہی گھر کے سب لوگ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ایسا لگا جیسے وہ سب خواب کے حصار سے باہر آگئے ہوں۔ انہیں خواب کا تعبیر مل گیا ہو۔ صرف ان میں عبداللہ مبہوت بنا اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

گھر کی کفالت اٹھانے کا واحد شخص عبداللہ ہی تھا۔ ہر روز صبح روزی کی تلاش میں شہر جا کر مزدوری کرنے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ سامنے اسکے نوری گرم گرم کشمیری چائے کی چسکیاں اپنے حلق میں انڈیل لیتی لے رہی تھی اُسے شفقت بھری نظروں سے تکتی ہوئی کسی سوچ میں غرق تھی۔ شاید وہ اسکی بے بسی پر فکر کرتی ہوئی تجسّس کے سمندر میں بہت دور تک نکل آئی تھی۔ آئے دن شہر میں رونما ہو رہے وارداتوں پتھراؤ اور ہڑتالوں نے غریب کی پیٹھ توڑ کر رکھ دی تھی۔ تبھی تو عبداللہ کو بڑی مشکل سے گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔

نوری اتنی زیادہ کن رسیدہ نہ تھی۔ ان پڑھ اور گنوار ضرور تھی۔ برسوں سے

موسموں کا اسکا تجربہ تھا کہ کب اور کس وقت کیا کیا احتیاط برتنے سے منافع بخش کام کیا جاسکتا ہے۔ یہ سوچ کر اب اس نے ساری ذمہ داری بہو اور بیٹی دونوں پر چھوڑی تھی۔ دونوں وہاں جا کر ملیاری کیاریوں میں بیج کی آس پاس خالی زمین کو کھود کر گھاس پھوس اکھاڑتیں۔ پھر مٹی کو الٹ پلٹ کر اُسے برابر کر کے سبزیوں کے بیج بودتیں۔

عصر کا وقت تھا۔ ابھی آفتاب میں نمایاں گرمی کی آمیزش باقی تھی۔

باغ میں جانے کے لئے ایک متبادل پگڈنڈی بنی تھی۔ جو آگے دوسرے ملحق گاؤں سے جاملتی۔ اور

لوگوں نے ندی کے کنارے کنارے پر ایک باقاعدہ شکل دے دی تھی۔ ورنہ جو پختہ تارکول کی سڑک ان کے کھیت سے لگی گزرتی۔ اس راستہ سے شرفاً جوان لڑکے ولڑکیاں چلنے سے کتراتے اور خوف کھاتے تھے۔

بیچ راستہ میں پل سے لگ کر ایک بڑا میدان تھا۔ اس کے کنارے پولیس کی چھاونیاں تھیں۔ کئی سالوں سے انہوں نے اپنا ڈیرہ جما رکھا تھا۔ مامور سپاہی وہاں سے گزرنے والے راہگیر کو شناختی کارڈ دکھانے اور طرح طرح غیر قسم کے سوالات پوچھ کر تنگ کرتے۔

ان کا اکثر وہاں سے گزر ہوتا۔ آگے آگے گوبر کی ٹوکری غزالہ اپنے سر پر لیے جارہی تھی۔ پیچھے پیچھے سکینہ چلی آرہی تھی۔ اس کی بائیں بغل میں خالی ٹوکری اور بائیں ہاتھ میں درانتی تھی۔ انہیں اس بات کا احساس نہ رہا کہ باتوں میں الجھی ہوئی کیسے راستہ کاٹ دیا۔

لگاتار چند گھنٹوں سے کام کرتی رہی، بدن بے حال سا ہو گیا تھا۔ پھر بھی کام میں اس قدر منہمک رہیں یہاں تک کہ دور پہاڑی کے عقب میں آفتاب غروب ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اجالا تھا۔ اب چاروں طرف اندھیرا پھیل جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ خوفزدہ ہوئی۔ گرتی پڑتی جلدی جلدی قدم بڑھاتی بھاگتی آگئی۔

ابھی چند قدم آگے بڑھی۔ دفعتاً عبداللہ کے فون کی آواز سنائی دی۔

”غزالہ! ابھی تک وہاں کیا کر رہی ہو۔ آج تم نے کافی دیر کر دی۔“

”بھیا۔ راستے میں ہیں۔ ابھی گھر پہنچ رہی ہیں۔“

اس سے مزید اور کوئی بات نہ ہوئی۔ اچانک ان کے درمیان فون کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

بستی تک مسافت تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ دور سے کچے پکے مکانوں کی چھتیں صاف نظر آرہی تھیں۔ راستے میں کئی انجان اور جانے پہچان والوں کا سامنا ہوا۔ لیکن اس وقت ان کی حالت غیر ہو گئی جب انہوں نے چنار درخت کے پیچھے نامعلوم چار پانچ آدمیوں کو مشتبہ حالت میں مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا۔

گھبرا کر انہوں نے تیز تیز قدم اٹھایا۔ ابھی چند گز ہی آگے بڑھی تھیں کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پلٹ کر دیکھنے ہی نہیں پائی تھیں، اچانک انہوں نے کسی موٹے کپڑے میں اجنبیوں کے ہاتھوں اپنے آپ کو ملفوف پایا۔ اُف تک نہ کر سکیں۔ بڑی پھرتی سے ان کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا۔ جس سے چیخ و پکار حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگیں۔ مگر گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اپنے آپ کو چھڑا نہ سکیں۔

زونی کی بیقرار نظریں باہر دروازہ کی طرف لگی تھیں۔ ان نظروں میں انتظار موجزن تھا۔ عبداللہ دیوانہ سا بنا تھا۔ دیوانہ وار کئی بار کھیت پر بھی دیکھنے چلا گیا۔ مگر ہر بار مایوس لوٹ کر آگیا۔ آخر تھک کر بے حال پڑ گیا۔

دیر رات گئے تک یہ خبر پوری بستی میں گشت کرنے لگی۔ راتوں رات پولیس تھانہ میں قانونی ضابطے کے تحت رپورٹ لکھائی گئی۔

ساری بستی اس بات پر حیرت زدہ تھی۔ آخر وہ کہاں کھو گئیں؟ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ سورج چڑھتے ہی لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ جو رات کے کرفیو کی وجہ سے رکے پڑے تھے۔ انہیں تلاش کرنے کے لئے پھیل گئے۔

اچانک بستی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ دونوں کی لاشیں پل کے قریب ندی میں اس جگہ پائی گئیں جہاں اکثر پانی کا بہاؤ کم رہتا تھا۔ جس سے وہ دور تک بہہ نہ سکیں۔

ایک ہو کا عالم تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر امڈ پڑا۔ دیکھتے ہی ہر ایک کے چہرے پر ہوائیاں اڑانے لگیں۔ ہر ایک کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ کہ دوبارہ انہیں دیکھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر خون میں لت پت نیم برہنہ پڑی تھیں۔ جگہ جگہ ان کے کپڑے تار تار خون

آلودہ تھے اور جسم پر خراشوں اور گہرے نیلے داغوں سے چھلنی تھے۔ جیسے کئی بھیڑوں نے اپنے نرغے میں پھانس کر دانتوں سے نوچا تھا۔ دور تک پتھروں پر گھسیٹنے سے خون کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔

ابھی تک ان کی کھلی کھلی آنکھوں میں وحشت اور خوف بھرا ہوا تھا۔ اور چہرے کی زعفرانی رنگت پر درندگی کے آثار صاف صاف نمایاں تھے۔

ایک بڑا المیہ یہ تھا کہ لگ بھگ آدھ گھنٹہ پہلے کسی نے وہاں انہیں نہیں دیکھا۔ اب تو ایسا لگتا کہ چاروں اطراف وہاں موت کی بھیانک پرچھائیاں رقص کر رہی ہوں۔

دیر تک دوڑتے چیختے اور مشتعل لوگوں کے قافلے در قافلے سیلاب کے ریلوں کی طرح آرہے تھے۔ جیسے سیلاب میں کوئی باندھ ٹوٹ کر پانی بے سمت چلا آجاتا ہے۔

ان کے گرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ آہستہ آہستہ شور کم پڑ گیا۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہر کوئی اپنی دانست کے مطابق چہ میگوئی میں مصروف تھا۔ ''یہ کس کا ہاتھ ہو سکتا؟''

ہوس اور امارت کی شکار دونوں لاشیں کھلے آسمان کے نیچے سوگوار لوگوں کے کندھوں پر سوار قبرستان کی جانب لئے جا رہی تھیں۔

ادھر نوری خوف و ہراس کی چادر میں لپٹی ہوئی بوڑھے چنار کے قریب کسی کچی ٹہنی کی طرح لڑھک کر رہ گئی تھی اور وہ بوڑھا چنار خاموش سہمے ہوئے تماشہ دیکھتا رہا۔ جبکہ عبداللہ کا دور دور تک کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وقفہ وقفہ فلک شگاف نعروں کا شور بڑھتا ہوا پُر امن اور خوشگوار فضا پر تازیانے برسا رہا تھا۔ اس گھٹن اور دگرگوں حالات میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ کس جرم کی سزا میں ہوا ہے۔

کیا یہ کشمیریت کے قتل کا منہ بولتا ثبوت نہیں ہے۔!!!

..................☆☆☆..................

صدمہ

سب لوگ اُس ڈسپنسری کے باہر جمع ہوتے جا رہے تھے۔اور اُن کی چہ مہ گوئیوں کے شور میں یہ خبر بھی جنگل کے آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ایک دوشیزہ جو ماں بننے والی تھی نے اپنی بدنامی کے ڈر سے ندی میں کود کر خودکشی کی ہے۔ یہ سنتے ہی سادہ لوح عورتوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایک ایک دو دو کر کے ہجوم سے ایسے کھسک گئیں جیسے اُنہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

بھولے بھالے دیہاتیوں کے چہروں پر خوف و ہراس، اضطراب اور بے چینی کے علاوہ نفرت اور غصّے کے ملے جلے تاثرات کا ایک طوفان موجزن تھا۔ ہر ایک کے لب پہ ناشائستہ الفاظ تھے۔انکی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔

وہ چنار کے نیچے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا ہوا استفہامیہ نظروں سے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح ڈسپنسری میں داخل ہو کر اُس لڑکی کا چہرا دیکھ لے گا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اُس کمرے میں تھا۔ جہاں سفید کپڑوں میں لپٹی لاش بیڈ پہ پڑی تھی ۔اُس نے اندر داخل ہوتے ہی لاش کے چہرے سے چادر ہٹادی اور بے ساختہ درد و کرب کے مارے چیخ پڑا۔

سامنے کا منظر اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔اُسے لگا جیسے اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

سامنے اُسکی لاڈلی بیٹی کا پھولا ہوا چہرہ تھا۔

آستین کا سانپ

نوری نے ایسا کیا دیکھا تھا۔ جس سے وہ اچھنبے میں پڑ گئی اور اس سے رہا نہ گیا......!

لوگوں کی مت ماری گئی جنہوں نے طرح طرح کی افواہیں اڑا کر صمد شیخ کی ذات پر بھی اُوچھے تیروں کی بارش برسانا شروع کر دی۔ مگر اب کیا کیا جائے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت...... صمد شیخ لوگوں کی شک کی نظروں میں آ گیا۔ بھاگ کر کہاں تک جا سکتا تھا۔

نوری ان پڑھ ایک سیدھی سادی متھرانی تھی۔ صمد شیخ کے ملحق علاقہ سے لگی نالیوں میں صفائی اور سڑکوں پر جھاڑو دیتے اسکے متعلق تھوڑی سی واقفیت رکھتی تھی۔ دو بچوں کو پیدا کر چکی تھی۔ دل میں ممتا پھڑک اٹھتی تو خود کو روک نہیں پاتی۔ کب تک خاموش دیکھتی رہتی۔ صمد شیخ کے کہنے پر قلندر بابا کے جھانسے میں آ گئی۔ جس بوجھ تلے وہ دبی سسکتی جا رہی تھی اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

لوگوں کی من گھڑت کہانیوں سے وہم اور اندھے وشواس نے ایسی دائمی مرض کی شکل اختیار کر لی ہے عقل کے مارے آدمی ایک عظیم مرتبے سے گرتے ابلیس کا اتالیق ہو کر رہ جاتے اور اس جہالت میں نہ صرف وہ اپنا مال واسباب وروپیہ پانی کی طرح لٹا دیتے بلکہ اپنے بال بچوں کو بھینٹ پر چڑھا دینے میں گریز نہیں کرتے بہت سے افراد نسیت و نابود ہوئے تب اُن کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہ جاتا۔ اچانک ایک ایسا معمولی سا کرشمہ ہوا تھا۔ حیرت کے مارے جسے سب لوگ دنگ ہو کر رہ گئے۔

ادھر کئی مہینوں سے صمد شیخ کے اندر ایک عجیب سا بدلاؤ آ گیا تھا۔ ورنہ اس طرح اسکی زندگی بوجھ بنی سر پر سوار جیسی ننگی تلوار کھڑی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لئے کافی جتن کئے مگر غم کا پہاڑ اُسے اپنی جگہ سے ایک پل بھی ہلا نہ سکا۔ اسکی حالت دیکھی نہیں جاتی ہر کوئی اس پر ترس کھا رہا تھا۔

صمد شیخ سوچ رہا تھا۔ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ اُسے اپنے سر پر برسوں سے جو نحوست کا بادل منڈلاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا...... اس نے اپنے دل ودماغ میں اس بات کا اعادہ کر لیا کہ وہ پھر دوبارہ اپنی قسمت داؤ پر لگا دے گا۔ جب وہ قلندر بابا کے حضور میں آ گیا اور اسکے قدموں میں اپنا سر ٹیک

دینے پر مجبور ہو گیا۔ اُسے لگا کہ شاید اسکی مصیبتیں کم پڑتی دکھائی دیں گی ۔ یا کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس پر قسمت مہربان ہونا چاہتی ہو کوئی ایسا کرشمہ رونما ہو جائے کہ اسکی زندگی میں وارے نیارے ہو نے کے دن آجائیں۔ اس کا چہرہ نکھرا نکھرا سرخ مائل رنگ جیسا ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ لوگوں کی سوچ میں بھنور پڑنے لگے۔ اچانک وہ صمد شیخ کی زندگی میں رونما ہو رہی تبدیلی کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ شاید اسکی کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ لیکن جب وقت انکی بدگمانی کی مٹھی سے ریت کی صورت میں پھسلتا دیکھا۔ تو مجبوراً انہیں اس بات پر اعتبار کرنا پڑا ۔ کہ کوئی بڑا اسادھو سنت مہاراج یا قلندر بابا چٹان کی طرح کھڑا ہو جسکی دعاؤں کا اثر ہو۔ یہ سب طے کرنا مشکل تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے نوری اس واہمہ کی شکار ہوئی جس وقت اس نے صمد شیخ جیسے ایک معمولی پیٹو آدمی کو بادلوں سے کہیں اوپر آکاش کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے دیکھا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اسکی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔ مگر وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی اسکی انا کی پتنگ اڑتے اڑتے جھک کر کسی پیڑ سے جا اٹکی تھی۔ یہ تو رادھا کے رقص کے لئے نومن تیل جمع کرنے کی بات ہوئی۔ وہ قلندر بابا سے آس لگائے اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح جل رہی تھی اور ابھی تک وہ پہلا غم بھول نہ پائی تھی۔

نوری کا پہلا، جوان بیٹا تھا...... بہت سال قبل جب وہ روزی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تب یہاں زندگی اتنی سخت نہیں تھی اور نہ ہی دہشت گردی کی وباء پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن جس دن سے وہ گھر سے بھاگ نکلا۔ بسیار تلاش کیا لیکن دُور دُور تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اُس کا من پراگندہ اور پریشان ہوا رہا تھا۔ وہ اپنا من محسوس کر رہ جاتی۔ کبھی منجھلے بیٹے اجمل کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتی ۔ بچاری دکھیاری ماں تھی نا۔ اگر چہ وہ سخت سے سخت پتھر پگھلا سکتی تھی حتیٰ کہ اپنی جان دینے میں ہچکچاتی اور نہ چپ سادھ لیتی ۔ اس طرح کب تک وہ چار چار آنسو بہاتی رہتی ۔ وہ اپنی ناکامیابی کا منہ دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مگر جب اُسے تمام کوششیں رائیگان جاتی محسوس ہوئیں تو وہ صمد شیخ کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو یقین دلاتی رہی۔ قلندر بابا کے پاس دوڑی دوڑی چلی جاتی۔ تا کہ اس کا نور چشم باعزت رہا ہو کر آجائے......

نمائش گاہ کے قریب کھلی نکڑ کے عین پاس ٹھیک اس جگہ جہاں برسوں پہلے ایک چنار کا

درخت کھڑا تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک لاغر اور نحیف سا بدن اپنا ڈیرہ جمائے پالتی مارے بیٹھا تھا ۔ سامنے دہکتی ہوئی انگھیٹی میں ہمیشہ سوکھے ہوئے شجر کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں جلنے کی کڑکڑاہٹ کی آواز اور گہرے دھواں کا مجکا اٹھتا رہتا تھا۔ گرد اور دھول مٹی سے اس کا ڈھیلا بدن کوئلہ کی طرح سیاہ ہو گیا تھا۔ آس پاس جگہ انگھیٹی سے خارج شدہ راکھ اور مستعمل پانی سے گندگی اور عفونیت پھیلی ہوتی تھی ہمیشہ وہاں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی رہتی۔ ایسے میں صفائی کرمچاری ٹس سے مس نہیں ہوتے ۔ بہر حال صمد شیخ صبح و شام کے اوقات میں اس کا خیال رکھا کرتا تھا۔

بوسیدہ پھٹے پرانے کمبل اوڑھے اس کے مسلسل ہلتے بدن پر گوشت پوست نام کی کوئی چیز نہ رہ گئی تھی۔ ہڈیوں کا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کسی پنجرہ سے جیسے ہمیشہ اسکی سرخ خوفناک آنکھیں گھورتی ہوئی لگتیں۔ وقفہ وقفہ کے بعد وہ اپنے بھدے اور موٹے ہونٹوں میں سگریٹ یا بیڑی دبا کر زور زور کش لگاتا رہتا۔

یہ منظر روز دیکھنے کو وہاں سے گزرنے والے راہ گیر ذرا دیر رک جاتے۔ کچھ سوچ کر جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ یا دس روپیہ دئے جاتے۔ مغموم صورت بنا کر آشیرواد لیتے رہتے۔ چھوٹے چھوٹے پالی تھین لفافوں میں ڈبل روٹی۔ طرح طرح کے میوے، بیڑی اور سگریٹ کی ڈبیہ چھوڑ جاتے۔ بہت سے لوگ ناک سکوڑتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال کر بڑی سرعت سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

میرا اکثر وہاں سے گزر ہوتا لیکن نجانے کیوں میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی کہ چند ساعت رک کر یہ سب جانوں۔ ہر چند میرا دل ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ ایسے درویش نما ٹھگ سے پالا پڑ جائے اچھا نہیں لگتا۔ یہ سب میرے اصولوں کے خلاف تھا۔

اگر چہ یہ ایک بھیانک سچ ہے کہ اُسے کڑاکے کے جاڑے میں ٹھٹھرتی ویران راتیں کچھ نہ بگاڑ سکیں نہ چلچلاتی گرمیوں میں اس کا جسم موم کی طرح پگھلتا رہا۔ ہاں یہ بالکل انہونی بات کہ اس کا نیم برہنہ جسم مسیحا کا روپ جیسے سمجھا جانے لگا۔

یہ گویا کل کی بات تھی جب لالچوک بارونق ہوا کرتا تھا۔ دن بھر بازاروں میں لوگوں کا رش لگا رہتا۔ موٹر گاڑیوں اسکوٹروں اور منی بسوں کی ریل پیل اور شور و شرابہ میں جدھر نظر میں اٹھتیں ادھر خوب چہل پہل کا سماں دکھائی دیتا۔ ہر کوئی چہرہ مسکراتا ہوا کسی قسم کا فکر و درد نہ خوف رہتا۔

جھیل کے پانیوں میں کنول پھولوں کا مصلیٰ بچھا ہوتا۔آس پاس لگے باغوں میں ہریالی ہی ہریالی ہوتی موسم سہانا اور خوشگوار سب کچھ اچھا چل رہا تھا۔شام کے سرمئی آنچل میں جھیل کے سطح آب پر چاند کا مکھڑا دیکھنے میں بڑا لطف آتا۔دیش بدیش...... کے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا۔ساتھ ساتھ ملک کی دوسری ریاستوں سے بھی بھک منگے جوق در جوق آتے رہتے۔سیر سپاٹا اور سیاحتی مرکزوں پر جلوہ افروز ہوتے لوگوں کو دودو ہاتھوں سے لوٹنا انہوں نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔

ایک ایسی ہی جماعت میں وہ قلندر بابا کا بھیس بدلتا ہوا آیا تھا۔نمائش گاہ کے قریب اس نے اپنا ایک مستقل ٹھکانہ بنایا تھا۔ایک مدت سے کئی عقل کے اندھوں کو اپنا گردیدہ بنالیا......سارے شہر میں قلندر بابا کے نام سے جانا پہچانا تھا۔

نوری کی عقل ماری گئی۔وہ صمد شیخ کی باتوں سے ترغیب پاتے ہی اسکے جال میں ہرنی کی طرح خود کو پھنسنے سے بچا نہ سکی۔

وہ اکثر سوچا کرتی۔اسکے سامنے کئی بار صمد شیخ نے اپنی کسمپرسی حالت بتاتے بتاتے اپنی بے بسی پر خون کے آنسو بہائے تھے۔پھر بھی اُسے گھر کی چھت آسمان سے جا لگتی کبھی دیواریں زمین بوس ہوئی لگتی تھیں۔لیکن جب سے قلندر بابا کی خدمت کی۔اسکی دنیا بدلنے میں دیر نہ لگی۔

وقت ندی کے تیز بہاؤ کی صورت بدلتا رہا......اچانک ایک ایسی آندھی چلی۔جس سے کئی مہینوں تک فضا میں کثافت اور آلودگی گھس آئی اور سارے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔جس نے سارے پر سکون ماحول کو تتر بتر اور بگاڑ کر رکھ دیا۔

شہر میں جگہ جگہ پیہم ادھر بم دھماکے ہوئے۔کئی پولیس پکٹوں پر گرینیڈ پھینکے گئے۔کئی سرکاری اور نجی عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔جوان مرد عورتیں اور اسکولی بچے تشدد آمیز حرکتوں کی زد میں آکر دم توڑتے گئے۔بچاؤ کارروائیاں سب ناکام ہوئیں اور بالآخر کرفیو کا نفاذ کرنا پڑا۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھٹ گھٹ کر بارود کی بدبودار سانسیں لینے پر مجبور ہو گئے۔اس طرح بے دست و پا کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نہیں آسکتے تھے۔

کئی دنوں تک حالات جلد نارمل ہونے کی کوئی اُمید دکھائی نہیں دے رہی تھی۔رک رک کے گولیاں چلنے کی سنسناہٹ اور ہر گلی گلی کوچے کے موڑ پر فوجی پہرہ دے رہے تھے۔حفاظتی گاڑیاں گشت بڑھا رہی تھیں گویا سارا شہر فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ دن بھی کیا ہوا کرتے جب نمائش گاہ کی جگہ پر سیاحوں کی گاڑیوں اور موٹر کاروں کی ایک لمبی قطار لگی رہتی۔ باہر سے آئے ہوئے سیلانی یہاں دکانوں سے کشمیری کرافٹ بطور گفٹ آئیٹم خریدا کرتے۔ رات گئے تک بازار جمار ہتا۔ اس طرح دوکاندار خرید وفروخت کر کے روزی تلاش کیا کرتے ہر ایک مطمئن لگ رہا تھا۔

ادھر کئی دنوں سے صمد شیخ کو راتوں کی نینداور دن کا چین لٹ گیا تھا۔ وہ قلندر بابا کے غم میں پانی میں نمک کی طرح پگھل رہا تھا اور نوری کی حالت بھی ہو بہو اُس جیسی ہو رہی تھی۔

مسلسل تین دن تک کرفیو نافذ العمل رہا۔ سارا شہر سنسان اور ویران پڑا تھا۔ زندگی برف کی مانند جم گئی تھی۔ البتہ گھروں میں چھوٹے چھوٹے بچے دودھ کے لیے ترستے رہے۔ بوڑھے بیمار لوگ دوادارو کے لیے...... جوان کان دھرے ریڈیو، ٹی وی پر کرفیو میں ڈھیل دینے پر اتاولے۔ بے قرار ہو کر سارادن سونے۔ ٹی وی دیکھنے یا کھڑکی شیشوں سے باہر جھانکتے کانٹوں کے بچھے فرش پر جیسے ٹہلتے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس دوران کس جذبہ ایثار اور خلوص کے تحت مجھے مجبور ہونا پڑا۔ قلندر بابا کا دھیان رکھنا پڑا یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس علاقہ میں ان دنوں میں ایمرجنسی ڈیوٹی دے رہا تھا۔

کرفیو میں ڈھیل دی گئی۔

لوگوں کا اُمڈتا ہوا طوفاں نکل پڑا۔ جیسے کسی سیلاب سے باندھ کی دیواروں میں پانی پھوٹ کر بے سمت ٹھکانوں کی طرح چلا آیا ہو۔ دودھ دہی، چاول اور کریانہ فروشوں نانبائی کی دکانون کے باہر لوگ قطار در قطار کھڑے دکھائی دینے لگے۔

صمد شیخ سے رہا نہ گیا۔ اپنی بیوی زیبا کو تاکید کردی کہ وہ جلد سے جلد ضرورت زندگی کی چیزیں خرید لائے اور خود وہ دوڑتا ہانپتا ہوا قلندر بابا کے چرنوں میں آگیا......

دوسری جانب نوری بھی گھر کی تمام ذمہ داری اپنے شوہر رحمان کے سپرد کر کے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئی۔ اُس کا دکھ اسکے وجود پر اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ تذبذب کے بھنور میں اُسے عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی...... وہ سوچ کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ قلندر بابا کے سامنے وہ اجمل کو یاد کر کے بین بین رونے لگی۔

ایک دن کچھ یوں ہوا کہ ان کا منجھلا بیٹا اجمل اسکول سے آرہا تھا۔ اتفاق سے آتے وقت گھنٹہ

گھر کے قریب پولیس کے خلاف پتھراؤ مہم میں دھر لیا گیا۔ اُسے چھڑانے کے لیے پولیس کے سامنے منت سماجت کی مگر پولیس والے سنی ان سنی کر کے اپنی آنکھیں دکھانے لگے اور اُسے بھاری رقم بطور رشوت مانگی تھی بے بس تھی...... وہ اپنے سامنے آگے ساری دنیا تاریک پا کر قلندر بابا کے پیروں پر تھکی تھکی ہرنی جیسی آ گری۔ چند روز قبل کسی جنازے کا تابوت کی بے حرمتی پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔

آہستہ آہستہ حالات میں بتدریج تبدیلی آ چکی۔ کہیں کوئی دھما کہ نہ ہوا نہ کوئی فائرنگ ہوئی اور نہ بم پھٹا کرفیو دیوتا نے سب کچھ نوالہ بنالیا تھا۔ لوگ تنگ آ چکے اپنے کاموں پر نکل آئے۔ راحت کی سانس لے رہے تھے۔

پہلے کی طرح اب حسب معمول سارا شہر جگمگا اٹھا اور بے خوف و خطر اس کنارے سے اُس کنارے تک بے تحاشہ گاڑیاں، اسکوٹر، موٹر کاریں دوڑائی جا رہی تھی۔

میری ایمرجنسی ڈیوٹی پوری ہوئی...... تین دنوں کی رخصتی لے کر میں اپنے گھر چلا آیا یہ سوچ کر کہ اب تو حالات قدرے کافی سدھر گئے تھے۔ اپنی جگہ مطمئن تھا۔

جس دن میں اپنی ڈیوٹی پر جوائین کرنے آیا۔ اچانک جہاں میرے پاؤں تھے وہیں رک گئے۔ قلندر بابا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسکی جگہ خالی پڑی تھی اور وہاں ایک آوارہ کتیا اپنے پلو ں کو دودھ پلانے میں مشغول تھی۔

میں متحیر ہو کر ہونقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن کہیں بھی اس کا سراغ نہ مل سکا۔

اس جگہ وہاں ابھی تک گندگی اور عفونیت کا ڈھیر پڑا تھا۔ اِدھر اُدھر شراب کی چند خالی خالی بوتلیں پڑی تھیں شاید وہ رات کو پینے کا عادی تھا۔

دم گھٹتی ہوئی بدبو نتھنوں میں چڑھی تو طبیعت میں اس قدر جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی کہ خالی خالی پیٹ سے متلی آتے آتے رک گئی۔ چلنے کی آہٹ پاتے ہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ہٹ کر تارکول سڑک عبور کرتا ہوا دور کھڑے سپاہی سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

''قلندر بابا کدھر چلا گیا......؟''

''تم سے مطلب کیا......؟''

''بابا کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے'' میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

''پتہ نہیں ۔ایسے لوگوں پر کیا اعتبار۔آج یہاں کل وہاں۔اچھا ہوا یہاں سے دفع ہو گیا۔ ہمیشہ ٹریفک جام رہتا۔ایکسیڈنٹ کا خطرہ لاحق ہوتا''......پولیس مین کا جواب تھا۔

میرے ذہن میں فوراً خیال آیا اور اس لئے مجھے تھوڑا سا صبر سے کام لینا پڑا۔

اور جب سورج بوڑھے چنار کے عقب میں چلا گیا صمد شیخ نے بلا تامل جواب دے دیا۔

''صاحب میں نے پچھلے دو دنوں سے اُسے دیکھا نہیں شاید اُس نے یہاں سے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔کہیں اور کسی نا معلوم جگہ پر اپنا بسیرا بنایا ہوگا۔ملنگ لوگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔اُس کا جانا مجھے کافی دکھی لگا۔پرسوں شام کو وہ یہاں گرینیڈ دھماکوں میں بال بال بچ گیا تھا۔''

باتوں باتوں میں اس نے ایک گہرے راز کا افشاء بھی کر دیا کہ وہ آج تک قلندر بابا کی دن بھر کمائی پر ٹھاٹ کرتا رہا۔اسکی ذمہ داری صرف یہ تھی دن کے سارے کچرے کو پالی تھین لفافہ میں بند کر کے اپنے پرانے گرویدہ کے حوالہ کر دینا تھا جو شہر سے دور کسی جگہ دریائے جہلم کے سپرد کر دیتا تھا۔

نوری بھی اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔شاید اجمل کی رہائی پر گھر میں خوشیاں بانٹ رہی تھی قلندر بابا کے غائب ہوتے ہی وہ جیل کی سلاخوں سے باہر آ گیا تھا۔

صمد شیخ اس کرشمہ پر ششدر ہو کر رہ گیا تھا۔!!

تھوڑے دنوں کے بعد شہر میں سنسنی پھیل گئی کہ سرحد پار سے ایک اور دہشت گرد جماعت داخل ہو گئی ہے۔شاید اب دوبارہ حساس جگہوں پر بم یا گرینیڈ پھینکا جائے گا۔

اکثر لوگوں نے رائے قائم کر لی کہ اس سب کارستانی کے پیچھے قلندر بابا کا ہاتھ ہے۔

اصل میں وہ پڑوسی ملک کا کوئی جاسوس تھا......جو لوگوں کو قلندر بابا کے نام پر چکمہ دے کر انہیں بے وقوف بناتا تھا!!!

..................☆☆☆..................

چھوٹا قد

شام رات کے لبادے میں چھپنے کو بے قرار تھی۔ سرخ مائل آسمان کے نیچے دور دور تک دھان کے کھیتوں کا سلسلہ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک پتلی سی پگڈنڈی رینگتی دکھائی دے رہی تھی۔

سورج کی بجھی بجھی کرنیں سلیٹی مائل سیاہی میں ضم ہوتی جارہی تھیں۔ پرندے غول در غول نیم دائرہ شکل میں گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ڈھلاون شروع ہوئی۔ دائیں جانب چھوٹی سی بستی تھی۔ دوسری جانب اُنچے اُنچے درختوں کا ایک جھنڈ اور ان کے درمیان ایک پرانا مندر جو کرشن جی کے نام سے منسوب تھا۔ ہمیشہ اُسکا دروازہ کھلا رہتا۔ پاس سے دیکھنے پر دروازے کی سیدھ میں لبوں سے بانسری چسپان کرشن جی کی مورتی دکھائی دی۔ رنگ برنگے پھول مورتی پر نچھاور کئے جاتے اور جلتی اگربتیوں کا دھواں وخوشبو سارے ماحول کو معطر کرتی رہتی۔

سڑک پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت پرانی یادوں میں کھوئی ماروتی کار کو پوری رفتار سے دوڑائی جارہی تھی۔ اس کے بغل میں ایک نوجوان دوشیزہ بیٹھی باہر کے نظارہ دیکھنے میں اس قدر محو تھی۔ اسکی تجسس بھری آنکھیں بتارہی تھیں کہ جیسے کوئی کرخت خیال اسکے دل میں برابر کچو کے لگا رہا ہو۔ جبکہ معمر عورت اپنی پرانی یادوں کے سوت تانے باندھنے جوڑنے میں الجھی تھی۔

کار ایک جھٹکے سے مندر کے باہر پھاٹک کے قریب رک گئی۔ جونہی دونوں کار سے اتریں تو انکی اچٹتی ہوئی نظریں پجاری سے ٹکرائیں۔ وہ مندر سے باہر آکر سیڑھیوں سے اترتا ہوا قریب آگیا۔ چند لمحوں تک انہیں گھورتا رہا۔

اچانک پجاری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو کر وہ اپنے خیالات کی گھتی سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر جیسے ہی عورت کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

''جیون نامی یہاں ایک پجاری جی رہا کرتے تھے۔ کہیں دکھائی نہیں دے رہے، ہیں؟ ہم اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں لڑکی بھی پاس کھڑی ہو کر اُسکے قدموں کی طرف آشیرواد لینے کیلئے جھکی اور ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔۔۔ ' ہاں ہاں اُسے کہہ دیجیے کہ کوئی ان سے ملنے آیا ہے'۔۔اس کی آنکھوں میں گہری التجا تھی۔

اس دوران اُس کی ساتھی عورت جو شاید اسکی ماں لگ رہی تھی۔ متلاشی نظروں سے کبھی مندر کے آس پاس اور کبھی درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ مایوس ہو کر اُس نے پجاری کی طرف دیکھا۔

پجاری حیرت و استعجاب کی مورت بنا ان دونوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا کڑیل جوان اپنی جوانی کی شناخت پہلے ہی کھو بیٹھا تھا۔ اترے اترے چہرے پر بے ترتیب لمبی داڑھی، سر پر لمبے لمبے الجھے بال اور سر سے پاؤں تک ہلکی زرد معمولی دھوتی میں ملبوس وہ کوئی دل شکستہ لگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے کس نامعلوم وادی میں کھو گیا۔ شاید ماضی کے دھندلکوں میں بیتے واقعات کو کھوجنے لگا۔ جس نے اُسے سنیاسی روپ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ ماضی کے نقوش اُس کے سامنے آب و تاب کے ساتھ منڈلانے لگے۔

برسوں قبل، ایک دن صبح سویرے ایک ماروتی کار مندر کے سامنے آ کر رک گئی تھی اور اس میں پہلے ایک اپ ٹو ڈیٹ نوجوان اترا تھا۔ اترتے ہی پاس کھڑے ہو کر اُس نے جلدی سے بال ٹھیک کئے اور دو قدم آگے جا کر کسی کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک لڑکی اپنی گلابی رنگ کی ساڑھی سنبھالے کار سے اُتری۔ دونوں کسی عجلت میں نظر آ رہے تھے مگر تھے بڑے خوش......

خوشی کے مارے اسکا چہرہ نکھرا نکھرا سا تھا ساتھ والی لڑکی بہت حسین تھی اور جوان بھی۔ شرم کے مارے گردن جھکی جھکی سی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم آگے اُٹھاتی ہوئی نوجوان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مندر کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔ نوجوان نے چند قدم آگے بڑھ کر سامنے دروازے سے لٹکی گھنٹی بجائی۔ گھنٹی بج رہی تھی اس نے جھک کر بھگوان کو پرنام کیا۔ واپس اپنی جگہ پر آ کر لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور درزوازے میں کھڑے ہو کر اندر کا منظر دیکھنے لگا۔

یہ دیکھ کر لڑکی فوراً آگے بڑھی۔ ہو بہو اس کی نقل اتار کر وہی عمل دھرایا جو اس سے پیشتر نوجوان کر چکا تھا۔

اور واپس مڑ کر دوبارہ اُس کے قریب کھڑی ہوگئی۔

کچھ دیر تک دونوں ادھر اُدھر طایرَانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھیں کسی کی تلاش میں سرگردان ہیں۔ ان میں بے چینی کا طوفان امنڈ آیا ہو۔ پھر جیسے ہی خشک سوکھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی تو انہوں نے نظریں اُٹھائیں۔

مندر کے عقب میں ادھیڑ عمر کا پجاری اپنے بھدے دانتوں کی نمائش کرتے ان کی جانب آرہا تھا ہاتھ میں تھالی کے اُوپر جلتی موم بتی اور سندور بھرا کٹورا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گیا۔ قریب آ کر اس کے چہرے پر پھیلی مسکان واضع ہونے لگی۔ کچھ سوچ کر وہ بولے۔

بولو پتر یہاں اس دور دراز گاؤں میں کیسے آنا ہوا؟ کیا بھگوان کرشن کے درشن کئے؟ جب نوجوان نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی جھلک دیکھی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اُسے لگا جیسے وہ صیح مقام پر آ گیا ہے۔ اُمید کی کرن نظر آتے ہی وہ آہستہ سے بولا! ''ہم بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں ہماری شادی کرادیجئے۔ ہم منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں۔'' نوجوان نے بے باک ہو کر آنے کا مدعا بیان کیا۔

روپیوں کی بات سن کر پجاری کا من للچایا۔ نوجوان نے نوٹوں سے اُس کا کشکول بھر دیا۔ دولت کی مہک میں وہ کچھ بھی نہ بول پایا۔ فوراً ہامی بھرلی۔

الغرض ایک عرصہ بعد مندر کے ہال میں خوشی کا سماں بندھا۔ بیچ منڈپ میں اٹھتے آگ کے شعلوں سے ذرہ ذرہ چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پجاری منتر پڑھنے میں مشغول تھا۔ جبکہ وہ دونوں منڈپ کے اردگرد سات پھیرے لگانے کی رسم پوری کر رہے تھے۔

باہر آسمان پر بادلوں کے کڑکنے سے لمحہ بھر کے لئے بجلیاں چمکتیں اور غایٔب ہوتی رہیں جو شاید ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ کرشن جی کی مورتی کی نگاہیں دولہا دلہن کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اسکے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شادی کی رسوم پورے ہوئیں۔ دولہا دلہن آشیرواد لینے کی غرض سے آگے بڑھے تو پجاری ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اُن کو جانے سے روکا اور بڑی دیر تک سمجھاتا رہا۔ ایسے موسم میں کچی سڑک پر بارش سے کسی بھی حادثہ کا ڈر رہتا ہے۔ خوف وڈر کی وجہ سے پُجاری کی جھونپڑی میں رات بسر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اگلے روز اکھشے کمار اپنی نے اپنے پتنی آشارانی کے ہمراہ گھر کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا۔ اہل خانہ میں سب سے پہلے اپنی ماں کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ جب ماں اپنے آنے والے رشتے میں کسی جنبی

لڑکی کو بہو کی روپ میں دیکھا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اس پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چند مہینے قبل وہ اپنے کسی سہیلی سے بات پکی کر چکی تھی اور اسکی بیٹی کو بہو بنانے کی رسم میں ایک سونے کا نیکلس تحفہ میں دے چکی تھی۔ جسکا علم اکھشے کمار کو بالکل نہ تھی۔

اکھشے کماران کا اکلوتا اور لارڈلا بیٹا تھا۔ اسکی محبت کے سامنے زہر کا گھونٹ پی لینا پڑا۔ ڈر تو اُسے صرف اس بات کا تھا کہ اس کے غصیلے باپ کہنیا لعل کا ردعمل کیا ہوگا۔۔۔؟ اُسکی مرضی کے خلاف شادی ہو چکی تھی اور وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا

کہنیا لعل شہر کا بارسوخ تاجر تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے مراسم تھے مگر ایک شاطر ذہنیت کا مالک تھا۔ جب سر کے اُوپر پانی گزرتے دیکھا تو اس نے اپنا بھرم قایئم رکھتے ہوئے ہنستے ہنستے دولہا دلہن کو آشیرواد دیا اور گلے سے لگا لیا۔ جب کہ دل ہی دل میں بیٹے کی نافرمانی کے باعث سخت ناراض تھا۔۔۔!

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔

آشارانی کو سسرال میں تین مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ ایک عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگی۔ ہوایوں کہ نہایت ہی چالاکی کے ساتھ کھشے کمار کو باپ نے کاروبار کے سلسلہ میں بیرونی ملک روانہ کیا۔ وہاں رہ کر وہ کاروبار میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ آشارانی سے براہ راست کوئی ربطہ نہیں کر پایا۔

ویسے کئی بار اُسے ماں کے ساتھ بات کرنے کا موقعہ ملا۔ پوچھنے پر اتنا معلوم ہوتا کہ جب آشارانی چندروز کے لئے میکے چلی گئی اور واپس لوٹ کر نہیں آئی۔

اکھشے کمار باپ کی ترش مزاجی سے واقف تھا۔ اس کا رعب دار چہرہ ہمیشہ گھورتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آشارانی کے متعلق حال واحوال جاننے کی ہمت نہیں جُٹا پا رہا تھا اور نہ ہی اپنی بے چینی کا برملا اظہار کر سکتا تھا۔ البتہ آشارانی کی وفاپرستی پر اُسے برابر اعتبار تھا۔

الغرض کاروباری معروفیات میں مگن اکھشے کمار اپنی بیوی سے براہ راست رابطہ میں نہیں رہا۔ اس طرح پانچ سال کا عرصہ کیسے آنکھ جھپکتے گزرا۔ اکھشے کمار کو اس بات کا اسوقت اندازہ ہونے لگا۔ جب وہ بیرون ملک سے لوٹ کر گھر آیا۔ آشارانی کو گھر میں نہ پا کر اس کے دل کو ایک گہرا دھچکا لگا اور وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔

اس نے گھر کے افراد سے ایک ایک کر کے پوچھا اور پرانے نوکر راموکاکا سے آشارانی کے متعلق طرح طرح کے سوالات کئے۔ مگر ہر بار اُسے ایک ہی جواب مل جاتا جو وہ اپنی ماں سے سن چکا تھا۔

کئی بار اس نے سسرال کے پھیرے لگائے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا ٹھکانہ بدل دیا ہے اور پھر حالیہ قیام گاہ کے متعلق کسی کو علمیت نہ تھی۔ اکھشے کمار نے اپنی پتنی کو ڈھونڈ نکالنے کی بار بار کوشش کی البتہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک دن اکھشے کمار اپنے کمرے میں آشارانی کی یاد میں کھویا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہوسکتا کہ جاتے جاتے اس نے کوئی نشانی یا خط رکھ دیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ واڈروب میں پڑی چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ تھکا ہارا ڈوبے من سے میز کا ڈیرَ کھولا۔ تو اسکے ایک کونے میں ایک بند لفافہ برآمد ہوا۔ جسے شاید وہ پوسٹ کرنا بھول چکی تھی۔ یا خط پر اس کا مکمل ایڈرس لکھنے سے رہ گیا تھا۔ اس نے خط کو بار بار پڑھا۔ ایک ایک لفظ میں پیار سمایا ہوا تھا۔ اُسے لگا کہ جیسے الفاظ تیر ونشتر کی طرح سینے میں پیوست ہونے لگے۔ وہ جذباتی ہوا۔ کلیجہ باہر آنے لگا۔ اُسے خط کی عبارت میں آشارانی کی صورت اُبھرتی ہوئی دکھائی دی۔ جو حیا اور شرم سے جھکی جھکی اُسے باپ بننے کی خوشخبری اور مبارک باد دے رہی تھی۔ اور اس کا سر چکرانے لگا۔

خط کے سارے الفاظ اکھشے کمار پر کسی برق کی طرح گرے۔ اُسے ایسا لگا جیسے اس کا وجود زمین میں دھنستا جارہا ہو۔ آشارانی کی فکر ستانے لگی اور پھر بچہ دیکھنے کی چاہت جو دل میں مچلنے لگی اس کے جسم میں جیسے درد و کرب کی چونٹیاں رینگنے لگیں۔

''میں پاپی ہوں۔ میں سب سے بڑا گنہگار ہوں۔ کاش میں گھر سے باہر نہ گیا ہوتا یا پھر آشارانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کرتا۔'' وہ بے ساختہ بڑبڑاتا رہا۔ اُس کا ضمیر چیخ اٹھا اور خلاء میں ایک دلخراش آواز تحلیل ہوتی گئی۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ وہ بھاری بھرکم وجود کو گھسیٹتا ہوا آشارانی کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ اکھشے کمار نے سنیاسی روپ دھارن کرلیا۔ بستی بستی گاؤں گاؤں بھٹکتا پھرتا رہا۔ کہیں صبح کہیں شام گزارنے لگا۔ یہاں تک کہ مڑ کر اس نے اپنے گھر کا نام تک نہیں لیا۔

انجیلی بچپن سے بہت چالاک اور بڑی سمجھدار تھی۔ البتہ جب ضدی کرتی تو روٹھی روٹھی اپنا منہ لٹکائی رہتی۔ بچپن میں وہ گنیش جی کو اپنا پاپا سمجھتی جو برسوں سے آشارانی کے گھر میں رہ رہا تھا۔ اور اس کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ لیکن جب انجیلی سن بلوغ تک آ پہنچی تو اُسے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ اس گھر میں گنیش جی کی حیثیت صرف ایک ہمدرد کی تھی۔ جو عرصے سے ان کے گھر میں ملازمت کرتا چلا آیا۔

وہ آشارانی سے اپنے باپ کے متعلق جاننے کے لئے اصرار کرتی رہی اور اپنی نشتر نما باتوں سے اس کے دل ودماغ اور روح کو چھلنی کرتی رہی۔طرح طرح کے سوالات میں الجھاتی رہتی۔اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔

وقت گزرتا رہا۔وہ اپنی ماں کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔الغرض حقیقی صورت حال جاننے کے لئے اس کی ضد زور پکڑتی رہی۔ وہ اپنی ادھوری کہانی کا عنوان چاہتی تھی۔

ادھر آشارانی کمزور اور لاچار تھی......ایک بڑا ثبوت ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے سینے پر بھاری سل رکھے ایک عرصے تک اُسے ٹالتی رہی۔مرتے وقت آشارانی کی ماں نے اپنی بیٹی سے وچن لیا تھا کہ وہ انجلی کو اپنے باپ اور گھر سے بے دخل کرنے کے بارے میں کچھ نہ بتادے۔اور اس بات کو بھی نہ ظاہر کہ کس طرح سُسر نے غنڈوں کے ذریعے اُسے بستی سے نکال باہر کر دیا تھا۔مجبوراً اُسے دور دراز کے علاقے میں پناہ لینی پڑی۔جہاں انجلی نے جوانی کی دہلیز کو چھولیا۔

حالات بدلتے رہے۔رفتہ رفتہ ماں بیٹی کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہونے لگی۔آخر کار ایک دن اس نے اپنا دفاع کرنے کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ وہ انجلی کو اپنے ساتھ کرشن جی کے اس پرانے مندر میں لے آئی۔جہاں وہ انجلی کو اس پُجاری سے ملوانا چاہتی تھی۔جس نے شادی کی رسم ادا کی تھی۔

''آپ نے ہمارے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔''

پھر جیسے ہی اُس کی رس گھولتی آواز پُجاری کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگی تو وہ چونک گیا۔ایک عرصہ کے بعد آج اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی جانب ٹکر ٹکر دیکھتا رہ گیا۔

''شریمتی! تم جس جیون نامی پجاری کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔۔وہ سات سال پہلے بھگوان کو پیارے ہو گئے ہیں۔''

پجاری کی موت کی خبر سنتے ہی آشارانی کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔اس کا چہرہ کمھلایا۔اور پھر جیسے ہی منہ لٹکائے مایوس ہو کر واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔ پجاری نے بڑی بے چارگی سے اس کی جانب دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی جس میں تھوڑی دیر پہلے شام کا اداس ملگجی اندھیرا پھیلا تھا۔ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ اب جب کہ کوئی اس کی خالی خالی زندگی کو ... کب تک ادھوری کہانی کے درمیان رہ کر بین کٹھیا سی ہی بنا رہوں

گا۔کیا اتنے دکھ بھوگنے کے بعد آج بھی سکھ کی سانس لینا مجھے نصیب نہ ہوگا اور پھر حالات بھی پہلے جیسے نہیں لگتے ہیں بھگون نے اپنی کرپا سے سب مشکلیں آسان کر دیں ہیں اس کا دل بھر آیا اُسے رہا نہ گیا جھٹ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بول پڑا

''کہیں تم آشارانی............''

''ہاں مگر آپ۔۔۔؟

میں ہی تمہارا اکھشے کمار ہوں کیا تم نے مجھے ابھی تک پہچانا نہیں۔

''سوامی!''......

ایک دلخراش چیخ آشارانی کے منہ سے نکلی اور کہر آلودہ شام کی نذر ہوگئی۔دیکھتے ہی دیکھتے خزاں رسیدہ چمن کا رنگ بدل گیا۔سوکھے چپکے سیب جیسے گال جو وقت کی دھوپ میں تپ کر اپنی تازگی کھو گئے تھے ان پر نکھار سا آ گیا۔خوشی سے پاگل ہو کر آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار پھوٹ پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چھاجوں چھاجوں پیار کا مینھ برسنے لگا ہو۔۔دفتاً وہ جھکنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اکھشے کمار نے فوراً اپنے بازو لہراتے ہوئے اُسے سینے سے لگایا۔

پاس کھڑی انجیلی حیرت زدہ نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔برسوں سے اُسے جس بے نام کہانی کے لیے عنوان کی تلاش تھی۔آخر کار اُسے حاصل ہوا۔

کچھ دیر تک وہ ماں کی نظروں سے اپنی نظریں ملانے کی تاب نہ لا سکی۔ اصلیت کا انکشاف ہوتے ہی اُسے احساس ہو گیا کہ اس کی ماں دور بہت دور اُنچائی کی جانب رواں دواں ہے۔۔۔اور واقعی ماں کے سامنے اُسے اپنا قد چھوٹا دکھائی دیا۔۔

.................☆☆☆.................

پچھتاوا

رات کے دس بجے الارم بجنے لگا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ دیر تک اُسے اس بات کا احساس نہ رہا۔

ہوا یہ کہ دکان میں ٹی وی کے بڑے اسکرین پر عربوں کے خلاف اسرائیلی سامراجی فوجوں کی ظلم و بربریت کے منظر کی فلم دکھائی جارہی تھی جو چند روز قبل غزہ کے علاقہ میں کسی امریکی اخبار کے نامہ نگار نے عکس بند کی تھی۔

اس کا سارا دھیان اسی طرف مرکوز رہا تھا۔ یہاں تک کہ سب ملازم ایک ایک کر کے اپنے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو چکے۔ لگ بھگ گیارہ بجے کے قریب وہ اپنی کرسی میں دھنسا ہوا بجھی بجھی نظروں سے ٹی وی کو تکتے جارہا تھا۔

نجانے کتنی جانیں تلف ہوئیں۔ فلم کی پہلی قسط اختتام تک آگئی۔ گھڑیال پر نظر ڈالی۔ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً دکان بند کر دی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بازار میں آگیا جو بے رونق تھا......

غضب کی سردی تھی۔ سارا بازار اور میلی گندی سڑک بھی رات کی گہری تاریکی میں کسی مرگھٹ کی طرح ویران اور سنسان پڑی تھی۔ دُور دُور تک کوئی مسافر دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ صرف خاموشی میں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کتوں کی پراسرار بھونکنے کی صدائیں سنائی دے جاتی تھیں یا کچھ وقفے کے بعد سڑک پر موٹر کی تیز

روشنیوں سے زندگی کے آثار نمودار ہوتے تھے۔ ہر چند دُور آسمان کے مغربی گوشے میں چند ستارے کبھی چمکتے اور کبھی بجھتے ہوئے نظر آتے تھے۔

وہ سہما سہما گھبرایا ہوا خوف زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ پھولی ہوئی سانسیں عرق آلود بدن...... وہ کبھی اس طرح خائف اور دل برداشتہ نہ ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدم آگے بڑھاتا رہا۔

اس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔ گھر میں بیوی تھی۔ سعادت مند باشعور اور حسین و جمیل بھی...... دو

چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ بہت ہونہار تھے۔ کبھی کبھی بیوی کا منجلا بھائی ہفتہ میں ضرور ایک بار شہر آ کر کسی نئی فلم کا آخری شو دیکھ کر رات کو ٹھہر جاتا تھا۔ رات گئے تک اُسے کہانی سناتے پھر وہ دونوں اچھی بُری رائے قائم کر کے اپنے اپنے بستروں میں جا گھستے۔ صبح تڑکے نو دو گیارہ ہو جاتا۔ کئی سالوں سے اس کا یہی معمول رہا۔

گرہستی چل رہی تھی۔ ایسے میں روزانہ صبح وشام محلہ بھر کی چھوٹی چھوٹی نو عمر لڑکیاں اسکے گھر آ کر اسکی بیوی سے تلاوت قرآن پاک سیکھ لیتیں۔ بعد مغرب چند بالغ لڑکیوں کے علاوہ کئی جوان بوڑھی عورتیں بھی اپنے اپنے کام نپٹا کر چلی آتیں۔ فراغت سے نماز میں چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرنے کے سلسلہ میں گھر میں خوب چہل پہل رہتی۔

ایک عجیب سا روح پرور سماں رہتا اسکی بیوی خود بھی پنجگانہ نماز کی پابند تھی اور دوسروں کو بھی تلقین کیا کرتی۔ اسکی ان صفات کی وجہ سے بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

فرصت کے لمحات میں کپڑوں کی سلائی وکڑھائی اور رات دونوں بچوں کو ہوم ورک کر کے سلا دیتی۔ تھک جاتی تو آرام دہ کرسی میں دبک کر وظیفہ پڑھنا شروع کرتی۔ اسکی نگاہیں کھڑکی کے باہر اُسے راہ تکتی نظر آتیں۔ محبوب کا انتظار کتنا کٹھن اور صبر آزما ہے۔ ہر وقت دل ودماغ میں ہلچل سی مچی رہتی ہے۔ آہٹ ہوتی تو چونک پڑتی۔ بدن میں جھرجھری سی دوڑ جاتی۔ رات رات جاگتے تھکے ماندے خاوند کو باہر دہلیز پر کھڑا پاتی تو خوشیوں کی برسات میں نہا جاتی۔

بے حیائی کا زمانہ آن لگا۔ خاوند کو سمجھاتے ہوئے اسکی ہزار کوششیں بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر تھیں۔ چند غلطیاں ہوتیں تو ایک ایک گنی جاتی، ان کو نظر انداز کیا جاتا۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کا ضرور سدباب کیا جاتا۔ مگر وہ ابلیس کا چیلا جو ٹھہرا......

ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیتا۔ وہ بے زبان گائے کی طرح اندر ہی اندر خون کے آنسو بہاتی رہتی۔ ہر بار اسکا جواب کچھ کے لگا تا نشہ گھمنڈ بول رہا تھا۔ اس کا دل تو جیسے پتھر کی سل بن چکا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی۔

وہ آگے بڑھا۔ خوفزدہ تھا۔ جسم ڈھیلا پڑا کہ......اس کا دماغ ایسے بُرے وسوسے اور خیالات کی آماجگاہ بنا۔ اسکے ہونٹوں سے سیٹی نکلتی ہوئی آواز پراسرار ماحول میں گونجتی رہی۔ بوجھل قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ اسکے دل کی دھڑکنیں سست اور بے جان سی پڑ گئیں تھیں۔ سانس بھی رک رک کر چل رہی تھی۔

مونسپل پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا سر ایک بار پھر چکرانے لگا۔اسکے خیال میں یہ جگہ بدروحوں کا مسکن ہے جو تنہائی اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر لوگوں کو خوف زدہ اور پریشان کر دیتے ہیں۔لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو پارک کو صرف جواریوں اور شرابیوں نے اکھاڑا بنا رکھا تھا۔جورات کو راہگیروں لوٹ کر لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جیبیں بھی بھر لیتے۔مگر یہ سب باتیں آصف کے خیالوں سے کوسوں دُور تھیں لیکن وہ بھوت پریت کا قائل ہو چکا تھا۔

اس کی ہمت داؤ پر لگی اسکی عزت کو للکار رہی تھی۔اسکی پتھرائی ہوئی آنکھیں پارک کے دوسرے سرے پر مرکوز ہو گئیں۔تاریکی میں وہاں کوئی سایہ رنگیتا ہوا نظر آیا۔وہ سایہ کی حرکات وسکنات پر کڑی نگاہ رکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے آگے بڑھنے لگا۔

"پین......پین......پین!"

اچانک ایک کیتا پاس کی گلی سے بھاگتی ہوئی نکلی۔آصف بیچ سڑک پر کھڑا سراپا مجسمِ حیرت ٹھٹھک سا گیا۔چند لمحوں کے لئے اسکی حالت غیر سی ہوگئی۔اسکی سانسوں میں دوبارہ انتشار بڑھتا گیا۔اس کا ذہن ماوف ہو گیا۔

اسکے لڑکھڑاتے قدم آگے بڑھتے ہی اس نے سائے کو اپنے قریب......زیادہ قریب ہوتے ہوئے دیکھا۔کھمبے کے نزدیک پہونچ کر ایک برقعہ پوش عورت کا سامنا کرتے ہوئے خوف میں ڈوبی ہوئی آواز اسکے منہ سے چیخ بن کر نکلی۔

"کون ہو تم......؟" کسی ہونق کی طرح اس کا سراپا دیکھتا رہا۔قدرے مشکل سے حواس یکجا کیے۔اس کا سوال خاموشی چیرتا ہوا سنائی دے پڑا۔

"گبھرانے کی کوئی بات نہیں۔" وہ کہنے لگی۔"میں تو دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔کیا تم آصف میاں نہیں ہو۔" نسوائی آواز نے اُسے پھر چونکا دیا اور کسی عمیق گہرائی میں دھکیل دیا۔اس کا کلیجہ کسی زخمی پرندہ کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"لیکن تم کون ہو؟ میں نے پہچانا نہیں......" پھر جیسے ہی وہ کچھ سنبھل سا گیا اور بولا۔

"سب کچھ بتا دیتی ہوں۔کھڑے کھڑے یہاں کیا مجھے ساری بات بتانا ضروری ہے۔"اسکی آواز میں ایک اعتماد تھا۔

"اس وقت سنسان سڑک پر تمہیں مجھ سے کیا کام ہے۔میرے متعلق اور کیا جانتی ہو۔اپنا نام

تو بتاؤ......"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتی ہوں ابھی گھر تک اتنی مسافت طے کرنا باقی ہے۔"

اس کا برملا جواب تھا۔ وہ آگے پوچھنے کی ہمّت نہ کرسکا۔ نہ کوئی فیصلہ لے سکا۔ آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ پھر بھی وہ ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ مسلسل سوچے جارہا تھا۔ ذہنی کھچاؤ میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکا۔ اسکے سامنے وہ ایک پہیلی بنی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ وہ چپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ بھاگ کر کہاں تک جاسکتا تھا۔

عورت کا سڈول جسم اسکے اندرونی حرارت کو پگھلا دیتا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات اُسے کوسوں دُور تھی۔ نہ ایسا ماحول خوشگوار تھا۔ ورنہ نہ جانے کتنی جوان عورتوں کے ساتھ اس نے اس سے زیادہ ہیبت ناک راتیں ویران جگہوں پر گزار دیں تھیں۔ کتنی معصوم بھولی بھالی عورتوں کی مرمریں بانہوں میں دل کی آگ کو ٹھنڈک پہنچائی تھی۔

لیکن آج کی رات...... ان راتوں سے کتنی عجیب اور ڈراونی تھی۔ جسے وہ آج تک کبھی سوچ بھی نہ سکا تھا۔

تم پھر سوچنے لگے ہو۔ میرے قریب آؤ ابھی خطرہ ٹل نہیں گیا ہے۔"

اس کا ذہن جیسے پھر ہتھوڑے کی زد میں آگیا ہو بنا طلب نگاہوں سے اسکی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ باقی ماندہ زندگی کے لئے بھیک مانگ رہا ہو۔

اس نے آصف کی قوتِ برداشت بھی چھین لی کہ اب اسکی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو برف کی طرح جمنے لگا تھا۔ اس پراسرار عورت کا سایہ دماغ کے کسی کونے میں سرسرانے لگا۔ ایک پھانس بن کر اسکے دل میں برابر خلش پیدا کررہا تھا۔ بناء انکار کے وہ چپ چاپ اسکے ساتھ چل پڑا۔

دفعتاً پاس ہی ایک گلی سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ اندھیرے میں انہیں پہچاننا مشکل لگ رہا تھا۔

"سالا......! آج جورو کو ساتھ لئے صاف طور بچ گیا۔ ورنہ"

"ایسا موقعہ بار بار نہیں آتا۔ کیوں نہ اس موقع کا فائدہ اٹھایا جائے۔"

"چپ رہ احمق۔ عورت کا منہ اگر کھل گیا تو اسکی چیخ سن سن کر مرد گھروں سے باہر نکل آئیں

گے اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" گرج دار آواز سنساہٹ پیدا کر کے چند لمحوں بعد پھر دوبارہ خاموش ہو کر اپنی جگہ پر آ گئی۔

"بچ کر کہاں جائے گا۔ آج نہ سہی تو کل دوبارہ مل لیتے ہیں۔"

تھوڑی دور چل کر آصف کو ایسا لگا کہ انکے لہجے میں بلا کی مایوسی تھی۔ ساتھ ساتھ اسکے سان و گمان میں نہ تھا کہ اسوقت کوئی اسکی راہ میں روڑے اٹکا سکتا ہے۔

ایک محویت کے عالم میں آصف جس عورت سے خوف کھاتا رہا۔ اسکے سنگ رہنے سے اب اسکی سوئی ہوئی امنگیں جیسے جاگ اٹھیں۔ اسکی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ اسکے ساتھ ساتھ دُور بہت دور تک گم صم چلا آیا۔ چلتے چلتے راستے میں ابھی تک طرح طرح کے خیالات اسکے ذہن کے پردوں پر ضربیں لگاتے رہے۔ اس سے پہلے کبھی اس نے ایسا سوچا نہیں تھا۔

اس کی طبیعت الجھنے لگی۔ اُسے اپنی فطرت کا احساس ہوا۔ ایک تعفن اور بدبو آنے لگی۔ عمر بھر وہ گندگی کی دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ اپنی بیوی کا کوئی خیال رکھا نہ ازدواجی زندگی کے تقدس کا لحاظ کیا۔ اور نہ عہد و پیمان نبھا دیا جبکہ بیوی نے اطاعت گزاری میں کسی قسم کی کسر نہ چھوڑی تھی۔ آدمی کتنا جلد باز ہے۔ ابھی خوف کے چنگل سے باہر نہ آیا۔ اندر ہی اندر اسکے دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کسی کونے میں ایک دبی سی چنگاری اٹھی۔ جس نے اسکے جسم میں ایک ہولناک آگ سی لگا دی تھی۔ اور اس میں اس کا اندر کا آدمی جھلس رہا تھا۔

وہ کئی بار سوچتا رہتا۔ دل کے تہہ خانے سے آواز نکلی۔ اپنے آپ بڑبڑاتا رہا۔

"ہائے! کتنی حسین عورت اور یہ قاتل ادا......"

وہ اب سنبھل چکا تھا۔ چلتے چلتے اسکے تناؤ بھرے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی بُرے انسان سے کیا توقعات رکھی جاسکتی ہیں۔ اچانک اسکے ذہن میں ہوس کے گندے کیڑے کلبلانے لگے۔ کتے کی دم کبھی سیدھی ہوئی ہے اسکی آنکھوں میں شیطانی چمک سی آ گئی۔ ۔لیکن وہ ضبط کر گیا۔

دفعتاً نہ جانے کیا سوچ کر اس نے بے ہودہ خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

کشادہ سڑک کو عبور کر کے وہ تنگ و تاریک گلی کوچوں میں چلنے کا عادی تھا۔ ان ہی راہوں سے گزرتا ہوا عجیب عجیب خیالی دنیاؤں کو چھوڑتا ہوا اپنے مکان کے صحن میں آ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ حیرت

میں مبتلا ہو گیا کہ اپنے کمرے سے باہر جھانکتی چھن چھن کرتی ہوئی بلب کی روشنی سارے ماحول کو احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ ششدر رہ گیا۔ برقعہ پوش عورت کے پیراہن کا کوئی اتہ پتہ دکھائی نہ دیا۔ البتہ پلک جھپکتے ہی دروازہ کے باہر کوئی رنگیتا ہوا سایہ غائب ہو گیا۔

ڈر کے مارے اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اور اپنی بیوی کو مسہری پر بیٹھی تلاوت کلام پاک کرتے ہوئے پایا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھی۔

ایمان کی پختگی سے چہرے پر اطمینان کی تازگی چھلک رہی تھی ہوا کے جھونکوں سے سامنے ہینگر پر سیاہ برقعہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔

سارا ماحول دل پذیر، منظر اور روحانی کیفیت کا غماز تھا۔

تاہم چند لمحوں کے لئے وہ جیسے سن سا گیا۔ دروازہ پر کھڑا سراپا حیرت میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔

الارم نے رات کے بارہ بجادئے۔ دونوں سوئیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

..................☆☆☆..................

فاصلہ

"بھئی لال چوک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا" سواری نے پوچھا

"ایک گھنٹہ جناب" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

"باپ رے باپ۔ ایک گھنٹے میں فلائٹ دلی سے سرینگر پہنچ جاتی ہے۔

"جی ہاں ...... یہ ٹیکسی ہے کوئی ہوائی جہاز نہیں۔ ویسے تیز رفتاری سے گاڑی چلانے کا انجام دیکھ کر آپ ہسپتال سے لوٹ رہے ہیں۔ کہیں آپ کو دوبارہ وہاں جانے کا ارادہ تو نہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دبا دبا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

..................☆☆☆..................

پرندہ

قرآن حکیم کی ایک سورۃ میں حضرت یوسفؑ کے اس واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی سیرت اور حسن بصیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو سب بندوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

آج سے سینکڑوں برس پہلے ملک مصر میں شاہ العزیز کے دور میں ایک مشہور امیر گزرے ہیں۔ ان کی شان و شوکت کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے حرم میں زلیخا نام کی ایک امیر زادی بھی کافی مشہور تھی۔ سب سے حسین و جمیل خاتون تھی۔ حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوئی تو اُسے دل و جان سے چاہنے لگی۔ اس کے عشق میں بُری طرح گرفتار ہو چکی تھی۔ اُسے پانے کے لئے وہ مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی۔ ہمیشہ سہیلوں کے جھرمٹ میں حضرت یوسفؑ کی ثنا خوانی اور تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتی رہتی۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ انکے اصرار پر حضرت یوسفؑ جلوہ گر ہوئے تو سارے زنانہ خانہ کا ذرہ ذرہ منور ہوا، یوں جیسے سفید چمکتا ہوا اچانک سورج دیوان خانے میں آ گیا ہو۔ اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے تکتی رہ گئیں اور دل تھام کے رہ گئی۔ بے خودی کا عالم یہ رہا کہ سیب کی قاشیں بنانے کی بجائے انہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔

لیکن آج سینکڑوں برسوں کے بعد ایسی ہی زلیخا نامی ایک جوان سال خاتون، جسکی عمر لگ بھگ یہی کوئی پنتیس یا چالیس سال کی رہی ہوگی۔ شہر کی ایک شہرت یافتہ فرم ''زلفی'' کی مالکن تھی۔ کافی دولت مند ہونے کے علاوہ وہ شہر کی مشہور خواتین میں شمار ہوتی تھی۔

پڑھی لکھی، چنچل اور خوبصورتی کا نمونہ پر کشش سڈول بدن، نیلی نیلی آنکھیں اور گلابی ہونٹوں والی ایک مکمل عورت تھی۔

اب تک کئی جگہوں سے اس کے لیے شادی کے لیے پیغام آئے تھے اور وہ انکار کرتی رہتی ہمیشہ روز کی طرح ٹال دیتی۔ اسکی خواہش کے مطابق اُسے ایسا کوئی مرد نظروں سے نہیں گزرا تھا کہ جسے وہ اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچتی۔ اس خواب و خیال کے بھنور میں چکراتے ہوئے پھنس

کرہ گئی تھی۔تب اُسے اسوقت اس بات کا احساس ہوا۔ جب وقت کا پرندہ پرواز کر گیا تھا۔

آج وہ اپنے فرم کے کیبن میں سیکرٹری پوسٹ کے لئے اُمیدواروں کا اکیلی ہی انٹرویو لے رہی تھی۔موونگ چیر کے نرم گداز صوفے پر بیٹھے بیٹھے تھک چکی تھی۔سارا کمرہ تمام آرائشی چیزوں سے مزّین تھا۔اے سی،فریج،کلرٹی وی اور کمپیوٹر جیسے سائنسی آلات کے علاوہ میز پر مختلف مشروبات دستیاب تھے۔

کئی اُمیدواروں سے طرح طرح کے موضوعات پر مشتمل سوالات پوچھتے پوچھتے اور انکے صحیح سے کہیں زیادہ منفی جوابات سنتے سنتے اسکا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ابھی تک اسکے سارے سوالات کا کوئی صحیح ڈھنگ سے جواب دینے میں کامیاب رہا اور نہ اسکے معیار کی کسوٹی پر کھرا اُترا۔

بوجھل آنکھوں پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔چاروں طرف اداسی اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے پلکیں گرائی ہی تھیں کہ چپراسی کے اندر آنے کی آہٹ سنائی پڑی۔ناگواری سے اس پر برس پڑی،پوچھنے لگی......"اب کیا ہے ؟"

"ایک آخری کنڈیڈیٹ Candidate رہ گیا ہے۔اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

"بلاؤ اُسے بھی۔" بے دلی سے اُس نے اندر آنے کا حکم دیا۔

اگلے ہی لمحے اسکے سامنے ایک خوبرو تنومند کڑیل جوان کھڑا ہو گیا کہ اسکے ہوش اڑ گئے۔ہاف بیلوز سفید شرٹ سیاہ پتلون بڑے سلیقے سے سلجھے گھنگھریلے بال وہ باوقار اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔آج سے پہلے اتنا خوبصورت اتنا سمارٹ دلکش پر وقار چہرہ والا نوجوان نہیں دیکھا تھا۔اس قدر متاثر ہوئی۔شاید اسکی شخصیت اور چہرے سے جھلکتی معصومیت نے اسکا دل چھین لیا۔وہ حیرت کی تصویر بنی اس کو دیکھتی رہی۔دل میں کچھ کچھ ہونے لگا اور سارے بدن میں چونٹیاں رینگنے لگیں۔

اُس نے اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے بھی ایک بے تکا سوال پوچھا۔

"......تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"آپ نے پوچھا نہیں ہے میڈیم"

"او۔ہاں سوری! مسٹر تنویر حسیب۔تم کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو۔"......زلیخا نے آنکھیں جھکاتے فائل پر آخری نام پڑھا۔اپنی معذرت ظاہر کی۔

"شکریہ......"

''شادی ہوئی ۔ہے؟''اُس نے ایک اور احمقانہ سوال کیا۔

''نہیں۔''

حسیب حیران تھا لیکن یہ سنتے ہی زلیخیا کا دل بلیوں اچھلنے لگا مگر اس نے اس بات کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ دوسرا انرٹ شنٹ سوال پوچھ ہی لیا''شادی کیوں نہیں کی......؟''

''کوئی ڈھنگ کی لڑکی نظروں سے گزرے اور پھر......نوکری کے بغیر ایسی بات ممکن نہیں ہوسکتی؟''

وہ اندر ہی اندر میڈیم کے بے ڈھنگے سوالات سے تلملا اٹھا تھا۔لڑکی کے بارے میں عجیب و غریب رائے قائم کرتا رہا۔آج تک اُسے انیس انٹرویوز کا تجربہ رہا تھا۔ جرنیل نالیج کتاب کئی بار پڑھ چکا تھا۔ٹی وی پر کئی معلوماتی پروگرام دیکھے تھے۔اخبارات اور رسائل میں موجود کساد بازاری مہنگائی، چور بازاری، رشوت خوری اور طرح طرح کے انسداد جرم وارتکاب کی خبریں پڑھکر اور یاد رکھ کے پوری طرح سے لیس ہو کر آیا تھا۔لیکن اس مرتبہ جو سوالات پوچھے جارہے تھے وہ اسکی سوچ و فکر کے خلاف توقع تھے۔اُس نے اپنے دل و دماغ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے کسی بھی صورت حال میں انٹرویو کو ٹیکل Tackle کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

''گھر میں اور کون کون لوگ ہیں؟''

''بوڑھے ماں باپ ہیں۔دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن ہے۔گھر کا سارا خرچہ والد صاحب کی پنشن پر چل رہا ہے......''

''مجھے آپکی جوانی پر ترس آرہا ہے۔اس طرح اپنی زندگی کو برباد نہ کرو۔اگر میری صلح مانو تو میرے گھر میں آکر میرے ہو جاؤ۔ کیونکہ میرے پاس سب کچھ ہے۔دھن دولت، عزّت شہرت مکان فیکٹری میں یہ سب تمہارے نام کردوں گی۔ بہت سے لوگ مجھ سے ناطہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں تمہاری قدم بوسی کے لئے تیار ہوں۔بولو منظور ہے۔

یہ انٹرویو کا کلائمکس تھا۔نہ جانے بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچتی تھی اچانک جیسے کوئی آتش فشاں کا دہانہ پھٹ کر خاموش ہو گیا ہو۔تنویر حسیب بوکھلا کے رہ گیا۔بڑی دیر تک ہونقوں کی طرح کبھی اُسے اور کبھی چیمبر کے در و دیواروں کو دیکھتا رہا۔زندگی میں وہ پہلی بار اس دوراہے پر کھڑا تھا۔ سامنے حسن و جوانی، دھن دولت اور عیش و عشرت کی ایک پر فریب دنیا اپنی طرف بلا رہی تھی۔عقب میں دم توڑتی امنگوں، آرزوں اور خواہشات کا طوفان تھا اور اس کا مہیب آندھی میں اسکے بے سہارا والدین

اور بھائی بہن کے روتے بلکتے چہرے......

چند لمحوں تک وہ ذہنی الجھنوں میں ڈوبا رہا۔ کبھی زندگی کے نشیب و فراز کا خواب دیکھتا رہا۔ اور کبھی ماتم کناں سائے اسکے تعاقب کرتے رہے۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ ایک زمانے میں زلیخا نے بھی حضرت یوسفؑ سے التفات بڑھائے لیکن آڑے وقت میں اس نے کمال جرأت اور دانشمندی کا ثبوت دے کر رہتی دنیا تک اپنی ایک مثال قائم کرلی تھی ۔ آج صبح ہی اس نے آیات یوسف پڑی تھیں ۔ پھر اچانک اسکے اندر جیسے لاوا پھٹ گیا۔

''میڈیم ۔ میں تو شرافت کا قائل ہوں ۔ دولت تو آنی جانی ہے ۔ مجھے آپ اور آپکی جاہ و حشمت اور دھن دولت کی ضرورت نہیں اور میں اپنی غریبی میں ہی خوش ہوں......''

تنویر حسیب کی آواز گرم سیسہ کی طرح اُنکی سماعتوں سے ٹکرائی تھی کہ وہ جل بھن کر بولی۔

''ارے نادان ۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔''

''مجھے آپکا احترام ہے۔ لیکن اپنے والدین سے جس قدر بچھڑنے کا غم رہے گا اور ان کا پیار و محبت اور خلوص ملنا دشوار ہے ۔ تمہارے اس رشتہ سے ڈر لگتا ہے ۔ میں اس نئے رشتے کو قائم کرنے سے معذرت چاہتا ہوں اور اس چوکھٹ سے جس ارادے سے آیا تھا دور سے سلام کرتا ہوں ۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں کسی دن آپ سے ملاقات ہوسکے......''

یہ کہہ کر تنویر حسیب اپنے شانے اچک کر کیبن سے باہر نکل آیا۔ باہر سڑک پر لوگوں کی چہل پہل میں گم ہوگیا جبکہ زلیخا اپنا سامنہ لے کر ناخن چباتی ہوئی اُسے دور تک جاتے دیکھتی رہ گئی۔

وقت کا پرندہ حسب دستور پرواز کرتا رہا...... ایک کے بعد ایک موسم بدلتا رہا۔ زندگی کی تیز رفتار میں کسی کو دوسروں کے متعلق جاننے کی فرصت اور نہ کسی کے پاس دوسروں کے لیے وقت رہا ہے۔ زلیخا کی ایک ایک شے جیسے اندر سے ٹوٹ سی گئی تھی ۔ فیکٹری اور شوادم آگ کی نذر ہوگیا۔ شہر کے حالات اتنے بگڑے کہ کسی کو ایک اکیلی زلیخا کا خیال تک نہ آیا۔ اس کی انا کو جیسے کسی نے پاش پاش کردیا تھا اور پھر اسکے اندرون ایک خزان نے جنم لیا۔

وہ دمہ کی بیماری میں بُری طرح مبتلا ہوگئی تھی ۔ چلنا پھرنا دُور کی بات سانسیں گن گن کرلے رہی تھی ۔ موت کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ ایسی جگہ کی تلاش میں سرگرداں بھٹکتی رہی ۔ جہاں لوگ اسکے تجہیز و تکفین کے لئے پورا انتظام اور بندوبست کرسکیں۔

اسکی حالت قابل رحم تھی ۔ تار و تار بدن پر جا بجا پیوند لگے پرانے اور گندے میلے کپڑوں کی گٹھری

میں دکھائی پڑتی تھی۔ ہاتھوں اور چہرے پر بیسیوں پھوڑے نکل آئے تھے اور ان زخموں سے پیپ رس رہی تھی۔ ورم سے فٹ بال کی طرح چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اور آنکھیں دھنسی دھنسی دو چھوٹے چھوٹے سوراخ جیسی لگ رہی تھیں۔

بیگر ہوم کے باہر پھاٹک کے قریب اوندھی منہ پڑی تھی اور درد سے کراہ رہی تھی۔ تین ہٹے کٹے نوجوانوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان کی شکلوں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ زبردستی اُسے اندر لے جانے پر وہ مزاحمت کر کے اندر جانے کے لئے تیار نہیں ہو رہی تھی۔

ماتھے پر شکن جمائے تینوں آدمی اُسے بے دردی سے بلڈنگ کے احاطہ میں گھسیٹ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسکی من مانی کرنے پر آگ بگولہ ہو کر اُسے گالیوں اور گھونسلوں سے نوازتے زبردستی پر اتر آئے تھے۔ شاید وہ بیگر ہوم کے کرمچاری لگ رہے تھے ورنہ اس زمانے میں کسی کو دوسروں کا غم دیکھ کر ترس آجاتا ہے۔

اچانک ایک ماروتی کار گیٹ کے سامنے رک گئی۔ سلیٹی رنگ کے سوٹ زیب تن کئے جونہی تنویر حسیب کار سے نیچے اتر آیا تو مصیبت کی ماری عورت کے قریب آ گیا۔ وہ شکستہ حال عورت کو دیکھتا رہا تو اس پر ترس کھایا۔ اپنے ماتحت عملہ سے مخاطب ہو کر غضبناک لہجہ میں حکم دیا۔

اُسے فوراً اندر لے "چلو" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ عورت کو پلنگ پر لیٹا دیا گیا۔ تنویر حسیب خود اسکے رستے زخموں کو صاف کرنے لگا۔ مرہم لگایا اور تازہ مشروب پلاتا رہا۔

زخمی عورت کو قدرے راحت و سکون ملا۔ ڈر اور خوف کافور ہو گیا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور ادھر ادھر دیکھا۔ سہمی سہمی کانپتی آواز میں پوچھنے لگی۔

"میں کہاں آ گئی اور تم کون لوگ ہو؟"

"یہ سرکاری بیگر ہوم ہے میڈیم۔ مجھے پہنچانے کی کوشش کرو۔ میں تنویر حسیب ہوں۔ یہاں کا سپرانٹنڈنٹ ہوں۔ ایک بار میں آپکے چوکھٹ پر نوکری کے لئے آ گیا تھا۔ ذرا آپ دماغ پر دباؤ ڈالو یاد آئے گا۔"

اتنا سنتے ہی اس پر رعشہ طاری ہو گیا آج وہ ایک لمبی پرواز کر کے کسی عتاب کی زد میں آ کر اپنے اجڑے گھونسلے کے بکھرے تنکوں میں اٹک کر رہ گئی ہو......؟!!

☆☆☆

جوانی

ایک دن ایک ننھی نرم و نازک سی رنگین تتلی کہیں سے اُڑتی اُڑتی میری کمزور ہتھیلی پہ آبیٹھی ۔دور بیٹھی رانی نے دیکھا تو بھاگی بھاگی دیکھنے چلی آئی۔اس سے پہلے کہ قریب پہنچتی۔تتلی پُھر سے اُڑ گئی اور دُور آسمان کی وسعتوں میں اُڑتی اُڑتی پلک جھپکتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔یہ دیکھ کر میں کھو سا گیا۔قریب پہنچتے ہی رانی نے مچل کر پوچھا۔

'پاپا ۔پاپا۔۔۔میرے اچھے پاپا۔ ۔۔وہ کیا تھی ۔؟۔۔اور وہ کہاں چلی گئی ۔۔؟ کیا یہ دوبارہ لوٹ کے آئے گی۔۔؟''

میرے کانوں میں دیر تک اسکی آواز گنجتی رہی۔میں اس کے سوال میں محو رہنے کی وجہ سے کوئی معقول جواب نہ دے پایا۔رانی نہایت معصومیت سے دوبارہ پوچھ بیٹھی۔۔

'کیا وہ دوبارہ لوٹ آئے گی پاپا'۔۔۔؟

''ہاں بیٹا! ضرور آئی گی اور اس بار آکر تمہاری ہتھلی پر آبیٹھے گی۔'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

وہ بڑی خوش ہوئی اور خوشی سے اُچھلتی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اپنے بستر مرگ پہ خیالی ادھیڑ بن کی حالت میں پڑا، میں کمزور بوڑھا اُسے کیسے سمجھاتا کہ تتلی کی مشابہت میری جوانی سے ہے جو دوبارہ لوٹ کے آنے والی نہیں۔

..................☆☆☆..................

مفرور قیدی

آج دفتر میں میرا آخری دن ہے۔

تمام دفتری معمولات سے یکسر خلاصی ہوگی۔

ایک ایسا اعزاز...... استعارہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

زندگی کے پورے ۵۸ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور پتہ نہ چلا۔ دوڑتی بھاگتی زندگی کی مصروفیات میں اچانک ایک ٹھہراؤ سا آیا۔ جیسے میرے سامنے کوئی آہنی دیوار حائل ہو۔

سوچتے سوچتے ایک نئے باب کی شروعات ہونے سے اب ممکنہ الجھنوں اور کربناک وسوسوں کے شکنجے میں آکر زندگی کی رعنائی کا ایک ایک لمحہ یکدم مغموم سا دکھائی دینے لگا۔

زندگی میں یہ کوئی نئی انوکھی بات ہوتی تو تعجب و استعجاب سے طبیعت بگڑ جاتی۔ ذہنی عارضہ نہ سہی۔ احساس کمتری کے خیال سے مغلوب ہو کر زار زار رُو پڑتا۔ ایسا نہ کرتا تو شاید اپنی غلطی سے پشیمان ہوتا اور اپنا سر شرم سے جھک جاتا۔

ذہنی تناؤ...... لاچارگی...... اُداسی اور مایُوسی۔!

کبھی کبھی صابر اور شاکر کے ماتھے پر بھی شکن آلودہ سلوٹیں اُبھر آتی ہیں۔

میری اوقات ہی کیا ہے۔ ایک افسردگی اور پژمردگی کی کھلی کتاب...... دیمک زدہ اوراق کا ایک پلندہ۔!

۳۱/ مارچ ۲۰۰۸ء

ڈائری کا آخری صفحہ ابھی تک خالی پڑا ہے مکمل ہونے میں ابھی چھ گھنٹے کی مسافت درکار ہے۔

۳۵ سال کے بعد ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہو رہی ہے۔ قدرت کا احسان ہے اچھی کار کردگی ہی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ عزت اور وقار سے ریٹائرمنٹ ہو رہی ہے۔

یوں تو ہر ملازم کو ۵۸ کا ہندسہ گراں معلوم پڑتا ہے۔ جب گھڑی کی چھوٹی سوئی ۵۸ پر اور بڑی سوئی ۳۴ یا ۳۵ کے ہندسہ پر ہو تو گھڑی اچانک رک جاتی ہے۔ تو آگے ٹک ٹک کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے اور ایک ملازم بکرا جیسا قصائی کے پاؤں تلے آجاتا ہے۔ چھری پر نظر پڑی تو جان کی سلامتی نہیں۔

یہ سوچ کر آنکھوں میں نمی اتر آتی۔ مایوسی اور اضطرابی کیفیت اتنی وسیع ہوگئی کہ دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور چاہ کر بھی آواز حلق سے باہر نہیں نکلی۔ کسی کو شکست کا شائبہ بھی محسوس نہ ہونے دیتا۔

کیا کروں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ خود کو ڈھارس دینا تو ایسا لگتا ہے۔ مجھ سے کچھ چھینا جا رہا ہے۔ مجھے بے دخل کیا جا رہا ہے۔

اس سب کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ تو ایک دھوکہ ہے۔ فریب ہے۔ فراڈ ہے۔ مجھے ابھی تھوڑی سی مہلت درکار ہے...... تھوڑی سی مہلت چاہیئے مجھے...... ادھورے کاموں کی تکمیل کرنا ابھی باقی ہے۔ ان کو پورا ہونا میرا مقصد حیات ہے۔ کیا کیا میں نے...... جتنا ہو سکا۔ اتنا تندہی سے کام نپٹاتا رہا۔ بدلے میں یہ اعزاز۔

ہائے! ملازمت سے سبکدوش ہونا ایک بڑے کربناک المیہ سے کم نہیں ہوتا...... شاید اس بوکھلاہٹ کے پیچھے میری مجبوری بڑبڑاتی ہے۔

گیا وقت ہاتھ نہیں آتا...... بڑی دیر بعد تھپکی اور تسلی کے مایا جال میں پھنس کر خود کو سوچوں میں اٹکا پایا۔

ذہن کے کینواس پر ماضی کے گھسے پٹے نشانات کو ڈھونڈتا رہا۔ تو ایسا لگا کہ حافظے میں کہیں پرانی یادیں آج بھی محفوظ تر و تازہ ہیں۔ اس وہم و بھرم سے میرا دم قائم ہے۔

کہتے ہیں کسی کے جانے سے گاڑی رک نہیں جاتی۔ پرزہ خراب ہونے یا ٹائر پھٹ جانے کی صورت میں وہی پرزہ یا ٹائر بدلا جاتا ہے۔ گاڑی بدل نہیں جاتی...... اس گاڑی میں کتنا طویل سفر کیا میں نے...... جیسے کل کی بات ہو۔ وقت میں برکت بھی ختم ہوئی ہے۔ اتنا اندازہ کر سکا۔ ورنہ شٹل کی طرح گام گام شہر شہر مشرق مغرب، شمال جنوب۔ اندھیرے اجالے۔ گرمی اور سردی سب منزلیں طے کرتا رہا۔ دکھ میں حوصلہ برقرار رکھا۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ کتنے جانے انجانے رشتے بنتے اور بگڑتے گئے۔

ذہن کے نہاں خانوں میں ساتھیوں کی جدائی کا دکھ ہو رہا ہے۔ سہہ لیتا ہوں۔ مگر معمولات میں اندیشناک خیال لحہ بہ لحہ میری مختصر سی زندگی میں آکر دہل کر رکھ دیتا۔ سارے احساسات۔ سارے اندیشے اور ان گنت وسوسے سوچتے سوچتے میری پچھلی کئی راتیں ایسی گزریں کہ نیند پلکوں پر جمتی نہیں۔ کروٹیں بدل بدل کر سارا بچھونا سلگتی انگیٹھی جیسا معلوم پڑا۔ جب کچھ بن نہ پڑتا تو ساری رات سگریٹ پھونک پھونک کر گزر جاتی۔

ایک بات ہوتی تو وہ نپٹ جاتی۔ ڈھیر سارے حل طلب مسئلے ایک اچھے خاصے آدمی کو بھی پریشان اور متفکر کر دیتے ہیں۔ دو دو بچیوں کی شادی کی ذمہ داری......اور اس پر خرچہ۔ دو چار کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھروندا علاج و معالج کی ناگہانی نسخوں کی بھر مار اور پھر پانچ افراد کی کفالت کا بوجھ گراں قدر مہنگائی سے بڑے بڑے دل گروہ رکھنے والوں کو بھی پسینہ آجاتا ہے......پھر پنشن کی حقیر رقم پر ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیتا ہے۔

اپنی بے بسی کا خیال آتا ہے تو یسوع مسیح کی شبیہہ کی جگہ اپنے آپ کو کھڑا پایا۔ سر پر کانٹوں کا تاج پہنا ہوا سارا شریر خون سے لت پت پایا۔ کس قدر سماج کے اندر بھیڑیا صفت لوگ بے بس آدمی کے خون کا قطرہ قطرہ چوستے رہتے ہیں۔ ان کی سوچ کتنی گھناونی اور مکروہ ہے کہ جہیز کی ہوس، نمود و نمائش اور بے جا فرمائش کی خاطر معصوم لڑکیوں کی زندگی کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان کی سوچیں پستی کی گہرائی میں اس حد تک جاتی ہیں کہ کتے اور بھیڑیے سے سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔ جس انگ پر پنجہ پڑا تو بس اس کو نوچ لیا......انسانوں کی شکل میں چھپے اماوس کی رات میں سیاہ اژدھے جیسے بے خوف و خطر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

اپنی لاچارگی کا احساس ہوا تو خوف سے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا۔ سردی کے باوجود ماتھے پر پسینے کا احساس ہوا۔

باہر سردی بڑھ رہی تھی اور بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دن کے اجالے میں گھنیرے بادلوں سے تاریکی کی ہلکی چادر سی پھیلی اور بارش ہونے کی علامت نمودار ہوئی۔ اچانک بوندا باندی شروع ہوئی۔ رک رک کر تھوڑی دیر تک چھتوں سے بارش کے قطرے ٹپکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

مارچ کا مہینہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے مہینوں کے مزاج سے ذرا مختلف اور منچلا ثابت ہوا ہے۔

پل میں ماشہ پل میں تولہ۔موسم بدلتا رہتا ہے۔ابھی خنک ابھی تیز وتند ہوائیں۔ابھی موسلا دھار بارش اورابھی برف کے گالوں کا گرنا کہ چھتیں بیٹھ جانے کا خطرہ اورابھی ایسی سُہانی دھوپ کہ بدن کا انگ انگ سینکنے کو جی چاہتا ہے۔

کانپتے بدن کو گرم اور کوٹ میں چھپا دیا۔قد نما آئینے میں قریب آکر جھانکا تو کوئی بوڑھا کھوسٹ میری ہر حرکت کا نقل اتارتا ہوا تھوڑی دیر بعد اپنا جان پہچان کا چہرہ نظر آیا۔مٹھی بھر داڑھی میں سفید بالوں کی ایک پتلی سی لکیر دیکھی گویا کسی ماہر مصور کے ہاتھوں سے کھینچی ہو۔دونوں کنپٹیوں کے گرد تین چوتھائی حصہ پر سفیدی نے اپنا پورا تسلط جمالیا تھا کہ قراقلی ٹوپی میں چھپے آج تک کوئی اس کا اندازہ نہ کر سکا تھا۔

دیر تک دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔اب مجھے پورا یقین ہو چلا کہ اب جو بوڑھاپے کی علامت ظاہر ہوئی ہے۔عمر کے آخری سرے پر کھڑا ہوں۔

گھبرا اٹھا۔اپنے آپ کو صابر اور شاکر ثابت نہ کر سکا۔

گھر والوں کو ملازمت سے سبکدوشی کی بات کہنے پر میری ہمت جواب دے چکی تھی۔شاید ان کو اس بات کا علم پہلے ہی ہو اور میرے سامنے چھپائے رکھا۔میں بھی ہمت جٹا نہیں سکا۔گو ایک سال کا عرصہ پہلے انکے سامنے اپنے سینے میں اس پوشیدہ المیہ کا اظہار نہ کر سکا۔بعید نہیں کہ میری مجبوری اور بے بسی کچھ بے عنوان کی کہانی جیسی لگتی ہو۔

میں نے اپنے بکھرے حواس کو ایک بار پھر مجتمع کیے۔

گردن اور چہرے کو اونی رفل کے مفلر سے چھپالیا۔صرف دیکھنے اور سانس لینے کی جگہ تھوڑی سی کھلی چھوڑ دی۔

کھڑکی کے باہر شیشوں سے طائرانہ نگاہ ڈالی۔اس اثناء میں ناچتی گرتی اوپر سے نیچے تک برف روئی کے گالوں کی ایک سفید باریک سی چادر تن گئی۔

ترسیلی لائن پر بیٹھ کے تین چار چڑیاں برف باری کا مزا لیتی رہیں۔دفعتاً دو چڑیوں نے فر سے کہیں اور اڑان لی تو بچارا اکیلا چڑا۔سوچتا ہوا۔تنہا پشیمان سا......اپنے خیالوں میں کھویا کھویا سا ڈوبا رہا......

ریٹائرمنٹ کے بعد کیا سوچا......؟

اچانک طارق کی بات نے چونکا دیا۔ آفس میں سینئر اسسٹنٹ کے پوسٹ کے باوجود بے تکلف ہوکر اوروں کو جلد ہی مرغوب کر لیتا......ایمانداری اور تندہی سے اپنا کام کر لیتا اور دوسروں کا ہاتھ بھی بٹا دیتا......

’’ابھی کچھ نہیں۔ کاغذات مکمل کرنے دو‘‘میں نے مختصر جواب دیا۔

’’نہیں، نہیں۔ میری مانو۔ ساتھ ساتھ اپنے لئے کوئی اچھا سا کام تلاش کر لینا۔ ورنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہے تو......‘‘ وہ ہلکایا۔ شاید آگے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

طارق کے مشوروں کا ہمیشہ قائل رہا۔ اس کی ہر بات میں خلوص ہوتا۔ معلوم پڑتا اُسے زندگی کے نشیب وفراز اور تلخیوں نے ایک اچھا خاصا سیانا بنا دیا تھا۔

’’ابھی سوچا نہیں کہ آئندہ کیا کیا جائے۔‘‘

سوچنے کا وقت کہاں رہا۔ گھر بیٹھے رہو تو ایک ملازم کی حیثیت سے زیادہ نہیں رہے گی۔‘‘ کچھ سوچ کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

’’جناب۔ ہمارے پڑوس میں ایک اچھا خاصا ریٹائر آدمی معقول پنشن کے باوجود دھوبی کا گدھا بنا پڑا۔ کبھی گھر کبھی گھاٹ کا اور بازار کے طواف میں آخر اللہ کے پیارا ہوا۔ گھر میں نوکروں جیسا برتاؤ اپنی ساری ٹھاٹھ باٹھ کھو بیٹھا اسی طرح دوسرا آدمی......‘‘اس نے اپنی دلیل دی۔

’’بھئی۔ میرے گھر والے ایسے نہیں۔ اُن میں ہمت‘ میرے منہ لگ جائیں۔ جب تک سانس باقی مجال ہے کوئی ایک لفظ بولے۔ اپنی ساکھ پر آنچ آنے نہیں دوں گا۔‘‘

میں مشتعل ہوا۔ نفرت کی لہر سارے جسم کو چھو گئی۔

’’میں دعا گو ہوں۔ خدا کرے۔ ایسی نوبت نہ آئے‘‘ وہ بڑبڑاتا رہا۔

بات میں دم ہے۔

میں سوچتا رہا۔ مجھے یاد آنے لگا۔

’’پنڈت جانکی ناتھ نے کیسی اپنی ساکھ کو برقرار رکھا۔ متواتر دو سال سے روزانہ دفتری اوقات میں گھر سے نکلتا......شام کو دیر سے واپس لوٹتا۔ دن بھر میونسپل لائبریری کے ایک تنہا گوشے میں ڈھیر

سارے اخبار اور رسالے پڑھتا۔ وقفہ وقفہ کرسی پر اونگھنا اس کا معمول تھا۔ برادری کے چند احباب کو اس بات کا علم ہوا تو وقتاً فوقتاً دفتر لوٹتے وقت اپنے ساتھ لیکر کسی ریسٹورنٹ میں گپ شپ میں حصہ لینا کار ثواب سمجھتے......

گھڑی میں دس کا الارم بجا تو گرتے گرتے خود کو سنبھال لیا۔

اوہو...... کافی دیر ہو چکی ہے ایسا نہ ہو......'' میرے ہونٹوں پر بے ربط الفاظ آتے آتے مایوسی کی نذر ہوئے۔

''اب کوئی جلدی نہیں۔'' مجھے محسوس ہونے لگا میں تمام پابندیوں اور بندشیوں کے حصار سے باہر نکل کر ایک آزاد پنچھی جیسا کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہوں۔

کمرے سے نکل کر برآمدے میں پرانے چھاتے کو اونگھتا ہوا اپنے انتظار میں پایا۔ سبزی کا خالی تھیلا غائب تھا۔ نکلتے ہوئے ''سویرے آنا'' اور فلاں فلاں سبزیوں کے نام صدر دروازے تک بیگم کی آواز سنائی دیتی۔ آج خلاف توقع حالات دکھائی پڑے۔ کوئی دکھ نہ ہوا۔ بے احتیاطی سے شانوں کو جھٹک کر سڑک پر چلا آیا۔

دفتر کے زینے پر دوسرا قدم رکھا تو پہلے مفلر ہٹا دیا۔ اور کوٹ پر برف کی ہلکی پرت کو جھٹک کر دیتا آگے بڑھا...... اچانک اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا تو بھونچکا سا رہ گیا۔ سارا کمرہ خالی خالی پڑا ملا۔ میز پر کاغذ کی ٹرے۔ گل دان اور قلمدان بھی غائب پایا تعجب ہوا۔ مانیگ چیر Moving Chair کی جگہ سٹور روم سے ایک پرانی کرسی نے لے لی تھی۔ سرہانے پر ہنگر میں لٹکتے تولیہ کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔

کچھ دیر تک دروازہ پر مبہوت سا کھڑا دیکھتا رہا۔ معاملہ کی گھتی سلجھاتا رہا۔ شاید میرے ذہن میں اس وقت سبکدوشی کی حقیقت کہیں روپوش ہو گئی تھی۔

''آیئے جناب۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ تمام سٹاف ممبر میٹنگ ہال میں موجود ہیں۔'' دفعتاً میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو طارق کو سامنے پایا۔ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ کے پیچھے کوئی طنز چھپا پایا...... ایک جھٹکا لگا۔ سامنے ایک سیاہ چادر تن گئی۔

سٹاف ممبروں نے سبکدوشی کی الوداعی پارٹی کی تقریب بڑی سادگی سے منائی۔ چھوٹے

بڑے افسروں نے اپنے اپنے طریقے سے خیالات کا اظہار کیا۔ خوبیاں بیان کیں۔ تعریفوں کے ان گنت پل باندھ دیئے۔

اختتام پر بطور یادگار کشمیری شال اور گولڈن جلد میں قرآن شریف کے تحفہ سے نوازا گیا۔ کافی پذیرائی ہوئی۔ وداعی پارٹی کب اختتام پذیر ہوئی۔ کوئی پتہ نہ چلا۔

آخری قدم دفتر سے نکلتے وقت اٹھے تو سب ممبران پیچھے پیچھے باہری گیٹ تک چلے آئے۔ تب بس اڈہ کے قریب طارق اور دو جونیئر کلرک سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے۔ راستے میں وہ کسی پنشن کے دفتری کیس کے بارے میں پوچھتے رہے۔

مجھے خاموش دیکھتے ہوئے شاید دلجوئی کرنا اپنا اپنا فرض سمجھا۔ اس طرح بوسیدہ ڈائری کا آخری صفحہ بھی مکمل ہوا۔

گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا میری کوئی انمول شے کہیں کھو گئی ہو یا کوئی چھین کے لے گیا ہو۔

باہر سردی کافی بڑھ گئی ہے بادل کڑکنے کی آواز سے بار بار سارے ماحول پر آہستہ آہستہ سراسیمگی بڑھتی جا رہی ہے۔

میں اپنے کمرے میں تنہا کسی مفرور قیدی سا بنا چائے کی چسکی لینے کا انتظار کرتا رہا۔ شاید ایک قید سے فرار پانے کے بعد اب دوسرے قید خانے کا دروازہ کھلا پڑا ہو۔

..................☆☆☆..................

نیا گھر

اُس کے جانے پر مجھے نہایت ہی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔

پہلے پہل اُس کی کمی کے احساس سے میں بالکل پریشان اور افسردہ رہنے لگا تھا۔میرے سمجھانے پر بھی اُس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور نہ ہی اپنی سوچ کا ڈھنگ۔وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔میں معاملہ کی گُھتی سُلجھا نہیں پایا۔مجھے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔تھک ہار کر میں نے اپنے خیال کو ہی اپنے ذہن سے نکالنے کی ٹھان لی۔

لیکن......ایک دن اچانک وہ اپنی روش چھوڑ کر آ گئی اور میرے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی چونکہ اب میں اپنا ارادہ بدل چکا تھا۔اس لیے میں نے اُس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی..........میں نے پہلے ہی پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ کہیں دور جا کر اپنا ایک الگ گھر بناؤں گا جہاں میں......صرف میں اکیلا۔۔تنہا اپنی زندگی کاٹ سکوں۔اور یوں میں نے ہجرت کرنے کی ٹھان لی۔مجھے یقین تھا کہ نئے گھر میں مجھے کسی کا نہ ڈر ہوگا ،نہ کسی کے ستانے کا کوئی خوف،نہ کوئی وحشت ہوگی اور نہ ہی گھبراہٹ..........اور یہی ہوا بھی..........

اب میں پچھلے کئی برسوں سے ''اُسی'' کے قتل کے الزام میں ایک نئے گھر (جیل) میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہوں۔

..............☆☆☆..............

بے ثمر لمحہ

رات کے پچھلے پہر سے لگاتار شاید کام کی وجہ سے ہلکی سی تھکان کا احساس ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کی۔ بوجھل سی فوراً اس نے فجر کی نماز کے بعد پلنگ پر دراز ہوتے ہی پلکیں گرادیں۔

جولائی کی پہلی صبح کو پچھلے ماہ کی بہ نسبت گرم اور ہوا بھی ساکت تھی۔ رات بھر دُور دُور تک خلاؤں میں اڑی اڑی سی وہ اسوقت بھی اپنے حال اور مافیہا سے بے خبر تھی۔ وہ نیند کی آغوش میں تھی۔

''اٹھ بیٹی! تیرے بھیاء کا فون آیا ہے۔ شہر نہیں جانا۔ دیر ہورہی ہے۔''

اچانک ماں کی شفقت بھری آواز سن کر چونکی۔ کروٹ بدلی۔ گھبراتے ہوئے اپنی بوجھل آنکھیں وا کیں۔

''جلدی کرنا پُتر شبنم۔ میز پر ناشتہ تیار رکھا ہے۔ اب جانے کو صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔''

وہ اُسے آگاہ کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہوئی الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی۔

شبنم نے لحاف کے اندر سے سر کو باہر نکال کر پہلے دیوار پر لگی گھڑی کو ایک ٹک دیکھا۔ پھر ہڑبڑا کر گرم لحاف ایک طرف ہٹادیا۔

کچھ لمحوں تک سوچتی رہی۔ اٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ ساتھ ہی ایک لمبی جمائی بھی لی پھر بھاگی بھاگی منہ ہاتھ دھونے لگی۔ اعظم گڑھ جانا تھا۔

امسال، وہ تعلیم سے فارغ ہوئی تھی۔ ایم۔ اے کامرس کے امتحان میں پہلی پوزشن حاصل کی تھی اب صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ سینکڑوں دفتروں کی خاک چھانی۔ پھر بھی معمولی نوکری تک کہیں نہ ملی۔

لڑکی پڑھی لکھی سمجھدار تھی......!

لیکن مستقبل کے اندیشوں سے اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اُسے کیا ہوتا جارہا تھا۔ چند مہینوں سے گھر میں بیٹھے رہنا۔ بات بات پر جھک جھک کرنا اور بھیڑ بکریوں کی طرح گھر میں رہنا پسند نہیں تھا۔

آزاد طبیعت کی مالک تھی۔

کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتا۔ سارا دن رسوئی کاموں میں ہاتھ بٹانا۔ کمروں اور صحن میں جھاڑو لگا دینا۔ نئے پرانے کپڑوں کی سلائی و دھلائی۔ تکیوں کی غلافوں پر کڑھائی کرتے کرتے عجیب سی دہشت نے گھیر رکھا تھا اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ گھر والے سوچ و فکر میں لگے۔ اُسے سیانی میں دیکھ کر الجھے الجھے کافی پریشان اور مضطرب تھے۔ لڑکی اب سیانی ہو چکی تھی۔

ڈھلتی عمر سے چہرے پر پکا پن آتے ہی کسی اچھے ور کی تلاش دامن گیر تھی۔ شاید یہی ایک کمی رہ جانے سے وہ ہر ایک کو کھٹک رہی تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود برسر روزگار نہ تھی۔

یوں دروازے پر دستک دینے والے پلٹ کر نہیں آتے۔

اس گھناؤنے سماج کو کیا ہوا۔ ڈھیر سارے جہیز کے ہوتے ہوئے بھی ملازمت کے بغیر شادی ممکن نہیں۔ اس طرح سینکڑوں پڑھی لکھی لڑکیاں گھروں میں بن بیاہی پڑی ہیں۔

ماں کو شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ شبنم کی آرزوں کے پیش نظر بڑے بھائی نے اپنے ایک شناسا کی نجی فرم میں کام کرنے کی صلاح دی۔ جب کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اچھی خاصی معقول تنخواہ پر اس نے بلا تامل اپنی رضامندی ظاہر کی۔

دوسرے شہر میں اسکی پھوپھی اتفاق سے کسی کلنک میں کام کرتی تھی۔ سر چھپانے کو جگہ ملی۔ اب وہ روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔ اچانک فرسٹ کلاس کا ریلوے ریزرویشن ٹکٹ ڈاک سے موصول ہوا۔

ایک نئی شروعات لئے وہ ریلوے اسٹیشن کے حدود میں داخل ہو کر سہمی سی گھبرائی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے خوف نے گھیر رکھا تھا۔ ''راستہ کیسے کٹ جائے مترا''۔ آج تک اسے کبھی اکیلئے لمبا سفر کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ عورت ذات تھی۔ ایک انجانا خوف اسے ستا رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر ریل کسی مریل گھوڑی کی طرح پاؤں پسارے اونگھ رہی تھی۔ بیس ڈبے پر مشتمل اس قصبہ میں نئی نئی آ چکی تھی۔ تعطیل سے لوگوں کا رش گھٹ کر رہ گیا تھا۔ گہما گہمی کسی حد تک کم دکھائی پڑتی تھی۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے جب وہ کمپارٹمنٹ کے قریب آ گئی۔ وہاں سے اندر کھڑکی سے کوئی جھانکتا سیاہ دھندلا سا چہرہ نظر آیا...... برتھ پر بیٹھے بیٹھے تھوڑی دیر تک نروس رہی۔ اور چہرہ بدستور تمتما تا رہا تھا۔ سانسوں پر قابو پا کر پہلے چہرے اور ماتھے پر پسینہ کو ہنکی میں جذب کیا۔ کاندھوں پر بکھری زلف پیچھے موڑتے ہوئے اسے ایک ٹک دیکھا۔ ان دونوں کے [illegible] کوئی [illegible] تھا

وہ اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ جیسے سن سا ہو گیا۔ کشمیری پشمینے جیسی لڑکی کے بدن سے آتی ہوئی خوشبو اور بالوں کی پرفیوم نے اس پر ایک انوکھی کیفیت طاری کر دی وہ اُسکے قریب آنا چاہتا تھا بھنورے کی طرح بدن کو چھونا چاہتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اُسے خواہ مخواہ خوف زدہ اور ہراسان کر دینا نہیں چاہتا تھا۔

کھڑکی کی طرف مڑ کر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ نس نس میں ایک چنگاری سی سرایت کر گئی تھی۔

اچانک ٹرین کی سیٹی بج اٹھی۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ساتھ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔

ابھی وہ چور نگاہوں سے اُسے دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگا رہی تھی کہ اس نوجوان کو وہ کب اور کہاں ملی تھی۔ ایک عرصہ پہلے کے زمانے میں تلاش کرتی رہی۔ چہرے پر گھنی داڑھی حال و مستقبل کے درمیان جیسے دیوار حائل تھی۔

ٹرین اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔

"کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں آپ"

اس بات پر وہ برہم ہوئی نہ متاثر ہوئی۔ کسی قسم کے ردِ عمل کا بھی اظہار نہ کیا۔ وہ خوشامد پسند نہیں تھی۔ خاموش سب سنتی رہی۔ ناول "بند مٹھی سے بھاگا پرندہ" کی ورق گردانی میں محو رہی۔

کتاب کافی دلچسپ لگتی ہے۔ معاف کرنا خاموش رہنا میری عادت نہیں۔"

"آئینہ دیکھئے اپنا چہرہ ہر ایک کو خوبصورت لگتا ہے"...... نرم و نازک بادامی آنکھوں میں شوخی نہا رہی تھی۔

"واہ کیسی شاعرانہ بات کہی۔ ایسی باتیں کتابوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ آپ کی باتوں میں کس قدر مٹھاس ہے۔ شاید یہ مٹھاس ہمارے داچھی گام کے شہد میں بھی نہ ہو گی۔"

اس سے رہا نہ گیا۔ بات جاری رکھتے ہوئے سامنے کسی لاثانی کلپنا کی بے انتہا خوبصورتی میں ڈبکیاں لیتا رہا۔ پاکیزہ حسین مورت کی من ہی من میں پوجا کرتے ہوئے لطف اٹھانے میں مصروف رہا۔ وہ کچھ پل سوچتا رہا۔

ہو نہ ہو اس نے ضرور پہلگام کے لدّر نالے کا پانی پی لیا ہے۔ وادی لولاب کے ڈوبتے سورج کا منظر چرا لیا ہے۔ پانپور کے زعفران زاروں کی سرخی اور گلاب کی خوشبو چُرا کر اسکی پروقار اور دل نشین باتوں میں کتنی گہرائی ... وہ پل بھر کے ... کو دل و دماغ سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔

سورج سر پر آ گیا تھا۔ گاڑی میں سب اپنی اپنی برتھ پر یا کوپے coope میں اونگھ رہے تھے ۔لیکن آمنے سامنے کی برتھ پر یہی دو جاگ رہے تھے۔

کچھ سوچتے ہوئے خموشی کی دیوار پھلانگ کر وہ آہستگی سے پوچھنے لگا تاکہ سونے والے ڈسرب نہ ہوں۔ ''شاید پہلی بار سفر کرنے کا اتفاق ہے۔''

'' آں!'' خموشی کی دیوار میں شگاف پڑے۔لڑکی جھینپ سی گئی۔شرارتی نظروں سے دیکھتی رہی۔

''ٹرین سے......''

نوجوان نے دوبارہ بھرپور نظر ڈالی۔ساتھ ساتھ ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوتے ہی اس کا بدلتا تیور بھانپتے ہی اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہ اس سے زیادہ بول سکی نہ اسکی باتوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ظاہر سی بات ہے کہ کوئی شریف عورت کسی پرائے مرد سے مراسم یا یگانگت بڑھانے سے کتراتی ہے کیونکہ اُسے اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ تعلقات بڑھ جانے کی صورت میں اسکی عزت ہدف بن سکتی ہے۔ اسلئے وہ گھبرا کر خود کو سمیٹتی ہوئی چپ ہی رہی۔

اس کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔سارے وجود میں کڑواہٹ رچ بس گئی تھی۔اب خطرات کی گھنٹیاں بجتے ہی وہ گتھی کو سلجھانے میں دیر تک اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔

اُسے ہائی اسکول کا زمانہ یاد آ گیا۔جب وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی۔دھندلی صورتوں میں رضیہ، سملا، شیلا، شگفتہ، علی شفاعت، تسلیم و شہناز۔اسکی مایوسی میں اسوقت اور بھی اضافہ ہو گیا۔جب ذہن کے کینواس پر وہ اُسے چڑانے لگا۔

''نہیں۔نہیں۔یہ وہ نہیں ہوسکتا......''

وہ اول نمبر کا بدتمیز اور آوارہ تھا۔جو راہ چلتے ہی نہیں بلکہ کلاس روم میں بھی اپنی احمقانہ حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔اگرچہ وہ سارے اسکول میں اپنی ہر دلعزیزی اور جرأت مندی کے لئے مشہور تھا۔ مسلسل دو برس تک میٹرک میں فیل ہو کر اسکول کا رنگ لیڈر بن چکا تھا۔رضیہ اور سملا بھی اس کی وجہ سے اسکول چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔بیچاری! سارے اسکول میں بدنامی ہوئی تھی اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھیں۔پرنپل صاحب کی نوٹس میں آتے ہی انہوں نے اسکول سے نکال دیا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

''ہونہو!'' اچانک اسکے لب ایسے کھلے جیسے کافی عرصہ بعد سردی میں جمی برف پر سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی پانی کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔

''چھپانے سے بہتر صاف صاف بتادینے میں کیا حرج ہے۔'' نوجوان نے اسکے من کے اندر کے چور کر پکڑلیا۔

اس بات پر وہ اور زیادہ بوکھلا گئی۔ وہم کی شکار تھی بھاگ نہ سکتی تھی۔

اب اُسے پورا یقین ہوگیا۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اگلے اسٹیشن پر اترے گی نجانے اسوقت کہاں سے گزر رہی وہ اس تذبذب میں پڑ گئی۔

دور سے کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پیچھے بھاگتا جارہا تھا۔ ہرے بھرے فصل کے کھیت کافی دلچسپ لگ رہے تھے۔

لگتا ہے کہ آپ گھبرارہی ہیں۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' وہ اسکا ارادہ بھانپ گیا۔

لڑکی کو اسکی بات پسند نہ آئی پھر بھی جسارت کرتی ہوئی بولی۔

''آپ کو پہنچاتے مجھے اپنے ایک کلاس میٹ کی یاد آرہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھا جیسے

''تو کیا اسکی پہچان ہوئی۔؟'' اس نے نہایت متحیّر ہوکر پوچھا۔

''ابھی پوچھا نہیں۔'' لڑکی نے مختصر سا جواب دیا۔

ایسا ہوتا ہے۔ آدمی کچھ سوچتا ہے اور زبان سے کچھ اور نکلتا ہے۔

''پوچھ لیا ہوتا......'' نوجوان کو ایک اچھا موقعہ ملا۔ وہ جانتا تھا کہ بے لوث کھرے پن سے کیسے لڑکیوں کو جال میں پھنسایا جاسکتا ہے۔

''کہیں آپ مسٹر آصف علی تو نہیں؟'' اس نے بلا تامّل سوال کیا۔

''کون مسٹر آصف؟''

'' لگ بھگ دس سال پہلے وہ میرا کلاس فلیورہ چکا ہے۔ آپ کی شکل ہو بہو اس سے ملتی جلتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے''

''تو کیا میں اپنا خیال درست سمجھوں۔''

''حرج ہی کیا ہے۔ اگر آصف کے نام سے مخاطب ہوں۔'' چند لمحے سوچ کر اس نے جواب دیا۔

لڑکی نے دیکھا ابھی تک اس نے اپنی پرانی عادت چھوڑی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں جیسی اور لہجہ میں بچوں کی جیسی شرارت تھی۔

''کہاں تک ساتھ نبھانے کا ارادہ ہے؟''

اس غیر متوقع سوال پر دوبارہ چونک پڑتے ہی ہراسان اور خوفزدہ ہوگئی۔ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی۔ اسکا بس چلتا۔ اُسے ریلوے پٹری پر پھینک دیتی یا سر کے بال کھینچ کر ادھ موا کر دیتی۔ جب کچھ نہ چلا۔ غصہ سے بپھرتی شیرنی کی طرح دہاڑی۔

''کیا مطلب۔؟''

''میرا مطلب تھا۔ میڈیم آپ کہاں جا رہی ہیں؟......نوجوان فوراً تیور دیکھ کر مئودبانہ لہجہ میں پوچھا۔

''اعظم گڑھ۔ میرا بھائی انتظار کر رہا ہے وہاں۔''

کسی دوسرے مرد کا نام سن کر وہ نہ خوف زدہ ہوا اور نہ نروس۔ الٹا چور بنا مسکراتا رہا۔

عادت سے مجبور دودھ میں پلا سانپ بھی ڈسنے کے بغیر نہیں رہتا ۔لڑکی نے خیال کیا۔ اس کی کھوکھلی ہنسی مزید اشتعال دلا رہی وہ کوسوں دور اس برس کی اس واقعہ کو یاد کرتی رہی۔ جب ایک دن وہ اسکول ایکریشن پر کھیلتے کھیلتے بال بال بچ گئی۔

ایسا ہوا...... اسکول کے نویں و دسویں جماعت کے اسٹوڈنٹ پہلگام ایکریشن پر آئے تھے۔ خوش

گپیوں اور کھیل کود سے دل بہلاتی۔ تتلیاں جیسی اسکی سہلیاں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اونچے نیچے گھومتی پھر رہی تھیں۔ سبزہ زاروں میں اور مخملی گھاس پر پھدکتی اور گھومتی نظر آرہی تھیں۔ کچھ عاشق مزاج شریر لڑکے بھنوروں کی مانند انکے پیچھے پڑے ستاتے ۔

ہنسی مذاق اور بچکانہ حرکتیں کرتے کرتے اچانک شبنم کا پیر پھسل گیا اور وہ لدر نالے میں جا گری۔ ساتھی لڑکیوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور بچاؤ کے لیے پکارنے لگیں لڑکے

مدد کیلئے دوڑ پڑے۔

مگر پانی کا تیز بہاؤ دیکھکر نالہ میں اُترنے کے لیے ہمت جٹا نہ سکے۔

آصف ہار ماننے والوں میں کہاں تھا۔ جھٹ اپنی جاں کی بازی لگا کر نالے میں کود پڑا۔ شبنم پانی کے تیز بہاؤ میں دور تک چلی آئی تھی۔ ہاتھ پاؤں ایسے مار رہی تھی جیسے ریت کے ڈھیر پر چابک مار رہی ہو۔ آصف بھی پانی کے بہاؤ میں اس کے قریب پہنچا۔ قسمت سے کنارے سے نکلی ہوئی درخت کی ایک موٹی جڑ کی شاخ پکڑ کر شبنم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اتنی دیر میں باقی لڑکے بھی وہاں پہنچے اور دونوں کو کھینچ کر پانی سے باہر نکال لائے۔

اس حادثہ کو یاد کرتے کرتے اسکے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے فوراً پانی کا بوتل کا ڈھکنا کھول کر غٹا غٹ آدھے سے زیادہ حلق سے انڈیل دیا اور راحت کی سانس لی۔ کمپارٹمنٹ کی فضا مسلسل بوجھل اور معنی خیز رہی۔ باہر سورج کی تمازت برداشت سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

پانی کو دیکھتے ہی جیسے آصف پر کھانسی کا زبردست دورہ پڑا۔ اور وہ کھانسے لگا۔ چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑتے ہی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ شبنم نے یہ دیکھتے ہوئے پانی گلاس میں انڈیل دیا اور اُس کی طرف بڑھایا۔ گلاس کو چھوتے ہی بوکھلاہٹ میں گلاس گر پڑا اور شبنم کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں آیا۔ پانی سے شبنم کے کپڑے بھی بھیگ گئے۔ اسنے ہاتھ چھوڑ کر اپنے کپڑے درست کئے شبنم کو ایسا لگا کہ یہ سب آصف کی پرانی شرارت تھی۔ وہ غصّے سے بھپر کر بولی۔

"مجھے معلوم نہ تھا تم اتنے گرے ہوئے آدمی ہو سکتے ہو۔" شبنم طیش میں آکر اس پر برس پڑی۔

"یقین مانو میں نے..........."

"رہنے دیجئے۔ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" شبنم نے لقمہ دیا اور اپنی گیلی فراق کو درست کر کے بوتل کا ڈھکنا بند کر دیا۔

کمپارٹمنٹ میں ایک پراسرار خاموشی نے دوبارہ جنم لیا۔ کہ اب صرف پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی پڑتی۔

ٹرین کی رفتار مدھم پڑی۔ اعظم گڑھ اسٹیشن پر ٹرین رک گئی۔

ہاتھوں میں بریف کیس سنبھال کر دروازے کے پاس جب بڑے بھائی نے شبنم کو بسورتے

ہوئے دیکھا تو وہ پریشان ہوا۔ گلے مل کر پوچھنے پر شبنم نے شکایتی لہجے میں جلدی جلدی سفر کا خلاصہ مختصر بیان کیا۔

"اس کمینہ نے میرے ساتھ نازیبا حرکت کرنے کی کوشش کی۔"

پھر غصہ سے پاگل کی طرح چلاتی ہوئی بولی۔

بھائی کو اس پر کوئی تعجب ہوا۔ اور نہ لڑائی جھگڑا یا گالی گلوچ سے کام لیا۔ اُسے سمجھاتے ہوئے صرف اتنا کہا......"

جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔"

وہ کہاں ہمّت ہارنے والی تھی۔ اس کا کچومر نکال کر کلیجہ چبا دیتی۔ شرارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"وہ قہقہہ لگاتا ہوا بیساکھی کے سہارے دُور سے اونچی آواز دے کر کہنے لگا۔

"کیسا لگا۔ یہ کھیل تماشہ شبنم......"

"ابھی یہ تمہاری شرارت گئی نہیں آصف علی۔"

بڑے بھائی اور آصف دیر تک ہنستے جا رہے تھے۔ پیچھے سے پھوپھی کی کھنکارنے کی آواز بھی سنائی پڑتی تھی......

وہ بے دست پا کھڑی معصومیت سے اُسے دیکھے جا رہی تھی......!!!

..................☆☆☆..................

تارتار پیرہن

وہ اس مخمصے سے نکل نہیں پارہی تھی۔! تھوڑی گھبرائی سی پریشان حال تھی۔

اور وہ بوڑھا چنار کا درخت بھی بلیواڑ سڑک سے لگ کر ایک رنگ برنگ خوشنما پھولوں سے لدے کشادہ باغ میں ایک ایسی جگہ پر استادہ تھا کہ وہاں سامنے وہ اُسے سارے سارے دن تبسم بھرے چہرے اور شوخ نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔ اگر چہ وہاں اسکے گرد ونواح میں کئی چھوٹے بڑے پیڑ پودے تھے۔ لیکن وہ اس کے مقابلے میں ابھی کم سن نوعمر تھے۔ اس لیے اُن سے الگ وہ بوڑھے چنار میں دلچسپی لینا پسند کرتی تھی۔

اُدھر بوڑھا چنار بڑا منچلا اور البیلا ثابت ہوا۔ وہ اسکی خوبصورتی پر نہ صرف فریفتہ تھا بلکہ اُسکی غیر معمولی طلسمی کشش نے اس پر جادو کا اثر کر رکھا تھا۔ سامنے جب وہ اس حسن بے پناہ کے سحر خیز وجود کو صاف وشفاف شیشے کی مسہری پر دراز دیکھ لیتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی اپسرا چاندی کے بڑے تھال میں انگڑائی لینا چاہتی ہو۔

وہ بے حد خوبصورت تھی۔ تندرست بھی تھی۔ بالکل نرم نرم ملائم پھولوں کی طرح کومل۔ اُس کا نازک بدن جب محفل رقص وسرور میں تھرکتا تو سینکڑوں چاہنے والے لمبی لمبی آہیں بھرتے نظر آتے۔ ایک معمولی ہوا کا جھونکا بدن کو چھو کر گزرتا تو اس کا نرم ونازک باریک آنچل میں پھڑ پھڑانے لگتا۔ اسکی ساڑھی سے جیسے آسمان پر چودھویں چاند کا مکھڑا مسکراتا نظر آتا۔

اس کی پاکدامنی پر کبھی کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔ وہ مریم جیسی پاک اور ستیا جیسی پوتر سمجھی جاتی اس کے دامن کے ٹپکتے پانی سے فرشتے وضو کرتے۔ وہ گنگنانے لگتی۔ تو للہ عارفہ کی شاعری کے تقدس کو پامال کر دیتی۔ اس طرح ست رنگ کی قوس قزح بھی شرمانے لگتی۔ غزل کے شائقین اسکی خوبصورتی پر مرمٹتے۔ اُس کے مرمرین بدن کے نکھرے ہوئے پیچ وخم اور بے انتہا حسن وجمال سے مسحور ہو کر اپنی غزلوں اور نظموں میں رنگ بھر دیتے اور بوڑھا چنار اپنی محبوبہ کی تعریف سن کر بے اختیار ہو کر جھوم جھوم اٹھتا۔

گرمیوں کے ایام میں جب سورج سر پہ آتا۔ تپتی دھوپ اسوقت وحشت اور دیوانگی کا روپ اختیار کرتی اور نازک جسموں کو بے بس کر دیتی۔ بوڑھا درخت یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے اپنی گھنی شاخوں کا سایہ سانپ کی طرح لہراتے اور بل کھاتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔۔ پہلے اسکے پیر چوم لیتا اور پھر اسکی ننگی ٹانگوں سے لپیٹ جاتا۔ محبوبہ کو اسکی یہ بے جا حرکت بُری محسوس نہیں ہوتی۔

ڈر تو صرف اُسے اس بات کا تھا۔ جو اسکی برداشت سے باہر تھا۔ عاشق کے بھولے پن پر خشم آلودہ ہوتی اور فکر میں غلطان رہنے لگتی کہ بوڑھا چنار اس حقیقت سے بے خبر اُسے آنے والے لمحوں کا کوئی ادراک بھی تو نہیں تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس نے رات کے اندھیرے میں اسکے آس پاس کچھ پر اسرار سائے ٹہلتے ہوئے دیکھے۔ شاید کہ ان کے من میں کھوٹ تھی دن کے اجالے میں آنے سے کترانے لگتے۔ اُسے عجیب سی دہشت نے گھیر رکھا تھا۔

برسوں پہلے وہ کسی نیک خصلت آدمی کے ہاتھوں سے لگایا ہوا ایک چھوٹا اور نحیف پودا تھا۔ وقت آزاد پنچھی کی طرح اڑان لیتا رہا۔ ٹھرتی ہوئی برفیلی ہواؤں اور چلچلاتی دھوپ کی سوز و تپش میں پروان چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اب وہ بوڑھا ہو گیا۔

اُسے یاد ہو کہ نہیں کہ کتنے جاڑوں اور گرمیوں کے موسم ایک کے بعد ایک کر کے، بدل گئے۔ دُور دور تک، چہار سو اس نے اپنے مضبوط تنوں کو اور شاخوں کو پھیلا دیا۔ نجانے کتنے چیل کوؤں، طوطا مینا اور چڑے و چڑیا نے گھونسلے بنا ڈالے۔ ایک ٹہنی سے پھدک کر دوسری ٹہنی تک اور وہاں سے آسمان کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتے رہتے۔ تھکے ہوئے مسافر پسینہ سے شرابور اسکی چھاؤں تلے کچھ دیر ستانے کی غرض سے اپنی پشت ٹیکتے ہوئے مخملی گھاس کے فرش پر پاؤں پسارے سکون اور راحت محسوس کرتے۔

صبح کی پو پھٹنے سے پہلے آڑی ترچھی ٹہنیوں پر ہر روز وہاں سینکڑوں پرندوں کی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتیں ہمیشہ ادھم مچا رہتا۔ شام کو سورج غروب ہوتے ہی ایک عجیب سماں رہتا۔ یوں وہ اسکی جرأت مندی سے خائف ہو کر اسکی طرف کھینچی سی چلی آجاتی۔ اسکے ساتھ بغلگیر ہونے کو جی چاہتا مگر ایسا کرنا اسکے بس میں نہیں تھا۔

آج اچانک بہت دنوں کے بعد وہ کسی سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی خود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی احساس کے بگولے اسکے اندر آندھی کی طرح اٹھتے رہے۔ دفعتاً محویت کے عالم میں اُسکے سامنے ایک چونکا دینے والا منظر گھوم گیا۔ ایکا ایک گہری نیند سے جیسے جاگ اٹھی ہو۔ اس پر کونسا جادو اثر کر گیا کہ اُسے آنے والے لمحوں کا منحوس سا چہرہ صاف صاف دکھائی دیا۔

اب جبکہ وہ پچھلی کئی ساعتوں میں بیتے دنوں کو تلاش کرتی تو سامنے اُسے کھلا کھلا سا بچپن نظر آنے لگتا نیلوفر، کنول کے پھولوں کے پیچھے پیچھے دوڑتی، اچھلتی کودتی اور پھاندتی۔ غرض ہر قسم کی موج مستی میں دن گزارتی تھی مزید برآں جوانی کی دہلیز پر قدم جما کر اکثر اُسے ہاری پربت پر کھڑی مسجد شریف کے اونچے اونچے میناروں اور حضرت مخدوم صاحب کی زیارت سے روح پرور اذانیں دائیں جانب سے کان میں پڑتیں پھر اسی لمحہ پربت کے دامن میں ماتا ویشو مندر کی رس بھری بجتی گھنٹیاں اور اشلوک پڑھنے کی آوازوں کا شور بائیں جانب دوسرے کان میں سنائی دیتا ایک عجیب روح پرور منظر بندھا رہتا۔ عالم انسانیت کے لئے جذبہ ہندو مسلم بھائی چارہ اور ایکتا کی پاسداری کے درس میں مثالی روایات ہونے کا ثبوت فراہم کرتا رہتی۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اچانک مغرب کی دھول گرد سے لپٹی تند آندھی نے ہر خس و خاشاک کو تہس نہس کر دیا۔ کہ کسی کو تن من کی سدھ نہ رہی۔ حتّٰی کہ شفق کی لالی پیلی رنگت اڑا کر چنار کی ٹہنیوں کے ہرے بھرے سبز پتوں کو بے وقت موسم نے جھڑانا شروع کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ کالی مہیب گھٹا کا انت ہونے لگا۔ تھوڑے دنوں کے بعد آندھی کا زور ختم ہوتے ہی ہر شے اپنے رنگ و روپ میں واپس آنے لگی یا واپس آ گئی۔

اس نے اپنی فراخ دلی اور بزلہ سنجی کے ثبوت میں ابھی تک کسی کو مایوس ہونے نہ دیا۔ جس کسی نے اسکی چھاتیوں میں اترنا چاہا تو اُس نے اپنے سینے کی قبا چاک کر کے اُسے جینے کا سلیقہ اور آداب زندگی کا ڈھنگ سکھا دیا۔ ہنسنے اور ہنسانے کا بھرپور موقعہ دیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ لیکن آج وہ کسی حد تک اچاٹ، افسردہ اور دل برداشتہ تھی۔ اسکی حالت کچھ عجیب سی بدلی ہوئی نظر آتی اُسے ہر پل فکر مند کرتی رہی۔ اُسے ایسا لگا کہ اسکے قرب و جوار کا دامن پھر داغدار ہو گیا ہو۔ ہر وقت ہر جگہ کوڑا کرکٹ اور پالی تھین کی غلاظت پڑی رہتی۔ پھیلے ہوئے ان ڈھیروں سے اٹھتی ہوئی گندی باس سے اس کا کلیجہ منہ کو آ رہا ہو۔ کہ اب اُسکا رکی سانسیں لینا بھی مشکل ہو گیا۔

اس کے وہم و گمان میں یہ نہ تھا کہ اچانک اسکے خوبصورت اور صاف و شفاف آئینہ جیسے چہرے پر جگہ جگہ کالی پرت چڑھے گی اور نئے بدنما داغ اور پھوڑے نکل آئیں گے تو بدصورتی اس کا مذاق اڑاتی رہے گی۔ ایک ایک کر کے اسکے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اُس نے سنا تھا کو دریودھن نے دروپتی کی ساڑھی کھینچ کھینچ کر اُسے ننگا کرنے کی بہت کوشش کی مگر شری کرشن جی وہاں موجود نہ ہوتے تو ایک عورت کی عزت و ناموس کی کوئی قدر و قیمت نہ رہ جاتی۔ وہ سیخ پا تھی۔ اُسے کہیں بھی

کرشن جی دکھائی نہیں دیئے۔

اُسے اس بات پر تعجب ہوا کہ وقت نے الٹا پھیر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ ان حرص وہوس کے شیدائیوں نے وہی پرانا اپنا پنترہ بدل لیا ہے۔ دکھ تو اُسے اس بات کا تھا کہ اس کا دامن اب باولے کتوں نے چھینا جھپٹی میں لہولہان کر کے سارا بدن تار تار کر دیا اور اس چھیڑ خانی میں انہوں نے ساری قوت آزمائی کی۔ ہر کوئی اپنے منّہ میں جتنا گوشت کا لوتھڑا آیا اچک کر لے گیا۔ اُسے دانتوں تلے چبا کے اس پر اپنا قبضہ جما دیا۔

وہ خاموش بے سدھ و بے بس ان کا منہ تکتی رہی۔ خونِ کے آنسو بہاتی رہی۔ اندر ہی اندر من میں سوچنے لگی کہیں یہ وہی حضرت صالحؑ کی امت میں سے بچے کھچے لوگ ہی مت رہ گئے ہیں جنہوں نے بے وجہ بے گناہ اونٹنی کو مار مار کر اسکے کئی ٹکڑے کر دیئے تھے۔

شرم و حیا سے اسکی گردن جھکی جھکی سی رہی۔ اُسے اپنے آپ پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ وہ صرف ہر کسی کو بار بار یقین دلاتی رہتی رہی کہ اس کا جنم داتا شری کشپ رشی تھا۔ شنکر آچاریہ پہاڑی کے دامن سے لے کر آثار شریف حضرت بل تک پھیلی ہوئی صاف وشفاف پانی کا ایک بڑا ذخیرہ...... جھیل ڈل کے نام سے مشہور ہوئی۔

کتنی جگہ سے جسم چھل گیا۔ زخموں سے چور، نوچی گھائل عورت کی طرح وہ دنیا کی نظروں سے خود کو بچا نہ سکی۔

خود اس کے سپوتوں نے اسکا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا گویا کہ اب جیسے اسکی سرمدی وسعت سکڑ کر رہ گئی ہو۔ اسکی شناخت کرنا دسترس سے باہر لگا۔ دکھوں کے بوجھ تلے دب کر اٹھ نہ پائی۔ رکی رکی سی سانسوں سے اُسے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ فوراً ایک اور نئے غم کے پہاڑ نے آگھیرا جس نے اُسے بے حال اور افسردہ کر دیا۔

رات بھر تیز آندھی چلتی رہی۔ پُرخوف رات کے سناٹے میں لگاتار کلہاڑیوں اور آروں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہر ایک ضرب کے ساتھ اسکا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ طرح طرح کے وساوس نے آگھیرا۔ اُچھل اُچھل کر اس نے سدھ بدھ لینے کی کوشش کی لیکن مہیب اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ صبح ہوتے ہوتے بوڑھا چنار زمین بوس ہو چکا تھا اور بے ہوشی کی حالت میں زبان حال سے ہر گزرنے والے شخص سے یہ سوال کرتا رہا کہ یہ مجھے کس جرم کی سزا دی گئی ہے؟ کیا تم کل تک میری ٹھنڈی چھاؤں میں راحت نہیں پایا کرتے تھے۔۔ مہیوال کو سونی سے جدا کر کے تمہیں

کیاملا۔۔؟

وہ سجدہ ریز ہوکر محبوبہ کے دامن چھوڑ رہا تھا۔ جو اپنے عاشق کو پانی پلا کر ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جبکہ خود اس کے گھائل بدن کا پیرہن آج بالکل ہی تار تار ہو چکا تھا۔

..................☆☆☆..................

موت

ایک تیماردار نے اپنے مریض کی ناگفتہ بہ حالت اور سیریس کنڈیشن کو دیکھ کر ڈاکٹر سے راز دارانہ لہجے میں پوچھا "ڈاکٹر صاحب، آپ کی تشخیص کے مطابق یہ مریض اور کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے ۔۔؟ کافی غور وخوض کے بعد ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "ہونی کو کون ٹال سکتا ہے اور موت کا ایک دن معین ہے۔ پھر بھی اگر بیمار کو اچھی اور معقول غذا، بہترین تیمارداری اور بروقت دوا ملتی رہے تو قریباً ایک سال تک زندہ رہنے کا امکان ہے۔" ابھی ڈاکٹر یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ہسپتال کے چکنے فرش پر تیماردار کا پاؤں پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل زمین پہ گر گیا۔ اُس کے سر میں شدید چوٹ آئی اور وہ وہیں پر سدا کے لیے خاموش ہو گیا۔

..................☆☆☆..................

رُوداد چمن

تھی تو وہ بڑی سمجھدار، صابر شاکر اور اخلاقی لحاظ سے صحیح معنوں میں معصوم بھی۔ اسکا چھوٹا سا گھر اور اس گھر کے چھوٹے سیا آنگن میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتی اور ہنسی مذاق میں دن گزار لیا کرتی۔ ان کا دل بہلاتی رہتی۔ سارا گھر خوشیوں سے بھرا رہتا تھا پھر ایک دن اچانک اس پر غم کا ایسا پہاڑ ٹوٹا کہ کچھ بھی سوجھائی نہ دیا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ لگتا تھا جیسے قدرت نے نوشتہ تقدیر لکھنے کے بعد اس پر سیاہی پھیر دی ہو۔ وہ چڑچڑی سی ہوگئی۔ اب صرف روتی رہتی تڑپتی رہتی یعنی زندگی سے مایوس سی ہو چکی تھی۔ لوگوں نے سوچا اس کے دل پر جو گہری چوٹ لگی ہے شاید اس کے صدمے سے نہ بچ پائے گی۔ کیونکہ زخم اتنا گہرا اثر کر چکا تھا کہ چند دنوں کے بعد اس کی موت یقیناً ہو سکتی تھی۔ یوں بھی وہ اپنی زندگی کا خاتمہ ہی چاہتی تھی۔ بسا اوقات اُمیدیں آدمی کو جینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کسی مقصد نے اُسے خودکشی کرنے سے روکے رکھا اور وہ ایک انجانی امید کے سہارے زندہ رہی۔ کون جانے اس طرح کی اور ماؤں کا بھی ایسا ہی حال رہا ہو۔

دریائے جہلم کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ناگفتہ بہ بستی تھی، البتہ چاول میں کنکر کے برابر اس میں چند کھاتے پیتے گھرانے بھی موجود تھے۔ آزادی کے تقریباً ٦٠ سال بعد بھی یہاں نہ تو مستقل بجلی میسر تھی اور نہ پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام تھا۔ دن ہو یا رات ہمیشہ بجلی کی آنکھ مچولی جاری رہتی۔ بعض اوقات ہفتوں بعد بھی اس کی دیکھنا شکل وصورت نصیب نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ شام ہوتے ہی ساری بستی اندھیروں میں ڈوبی رہتی۔ اس غریب عورت کے گھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ اس کا مرد دن بھر مستری کا کام کر کے گھر آ کر اب سو گیا تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی تو چھوٹی بچی خاموشی سے موم بتی جلا کر اسے طاق پر رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسکے ہاتھ میں اردو کی کوئی کتاب تھی اور بھائی یعنی گھر کا چشم وچراغ ١٦ سالہ لڑکا ماں سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ طیش کے عالم میں اپنا پا شا بکتے ہوئے گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی

دے رہا ہے اور ماں اُسے خدا اور بہن کا واسطہ دے کر سمجھاتی ہوئی ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔
ماں ہے نا۔ بیٹے کی جدائی کیسے برداشت کر سکے گی۔ اسکے تن میں اس کی روح جو رچی بسی ہے۔ بھلا
روح کے بغیر جسم کی کوئی قدر و منزلت ہو سکتی ہے؟ اُسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا بستی میں اول سے ہی
تعلیم میں یکتا اور اچھے نمبرات حاصل کر کے گریجویشن پاس کرنے کے باوجود گھر پر ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے بیٹھا اپنی قسمت پر انسو بہاتا رہتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل کے بھیانک انجام سے دل
برداشتہ اور پشیمان تھی۔ پھر جب بچہ بڑا اور جوان ہو رہا ہو تو اس کے مطالبات کیساتھ ساتھ اس کے
جذبات کی بیداری میں بھی تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کا بیٹا بچپن سے ہی خاموش طبع سنجیدہ اور کافی
ذہین تھا۔ نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ قران شریف کے لگ بھگ دس پارے بھی حفظ کر چکا تھا۔
پھر جوں ہی وہ عزت نفس اور زندگی کو با مقصد بنانے میں مصروف ہو گیا تو اس نے ایسے لوگوں کو بھی
دیکھا جو زندگی کے معاملات میں احساس کمتری، سخت مزاجی، کٹر پسندی اور انتہائی غیر لچکدار اور بسا
اوقات بے رحمانہ رویہ اختیار کیے ہوتے تھے یہ دیکھ کر اس کے سوچنے کے ڈھنگ میں اصلاحی آداب
کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ ان لوگوں کی طرف کھنچتا چلا گیا جو ایک اسلامی
تشخص والا نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وادی میں ایسی تیز و تند آندھی آئی
جس نے یک لخت ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک دہشت بھرا ماحول پیدا کر دیا۔ ان
حالات میں لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ نوجوان جوق در جوق ٹولیوں کی صورت میں سرحد پار
چلے گئے اور جب وہاں سے اسلحہ سے لیس ہو کر واپس لوٹے تو راستے میں سینکڑوں نوجوان حفاظتی
دستوں کی گولیوں کی زد میں آ کر لقمہ اجل ہو گئے۔ بیشتر کو پکڑ کر جیل کی کال کوٹھریوں میں قید و بند کی
صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے ٹھونسا گیا بیشتر نہ صرف تڑپائے گئے بلکہ بے نام و ننگ دفنائے
گئے۔ اور جو جان بچا کر سرحد پار کرنے میں کامیاب رہے اُنہوں نے شہروں اور قصبہ جات کا رُخ
کر لیا۔ انتقامی جذبے کے حامل افراد سراپا احتجاج تھے۔ جہاں کہیں کوئی وردی پوش یا نقاب پوش نظر
آیا بندوقوں کے نشانے پر آ گیا۔ اچانک حالات ابتر ہو گئے۔ کل تک جہاں فاختاؤں اور کوئلوں کی
کوک گونجا کرتی تھی۔ خوشحال اور دل لبھانے والی بولیاں کانوں میں پڑتی تھیں۔ جہاں محبت اور
اخوت کی قندیلیں روشن تھیں وہاں اب گولیوں کی گھن گرج اور دستی بموں کے پھٹنے کی آوازیں سنائی
دیتیں۔ زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک آگ سی لگی تھی اور اس آگ کی تپش میں بہت کچھ جل کر

راکھ ہورہا تھا اور اس راکھ سے محض دھواں اٹھ رہا تھا۔

ایک ہو کا عالم تھا۔لوگ سہمے سہمے، حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے تھے افراتفری کے ماحول میں ایک دن نوری رات گئے اپنے بیٹے کا انتظار کررہی تھی کہ شاید ابھی نہ تو ابھی آئے لیکن جب سحر کی سپیدی مشرق کی اور سے نمودار ہوئی اور وہ گھر لوٹ کے نہ آیا۔تو وہ بے چین ہوگئی۔اس دن سے اب تک اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔جانے کہاں چلا گیا۔اپنی یادیں چھوڑ کر جانے کہاں روپوش ہوگیا تھا۔ورنہ بسیار تلاش کرنے پر ضرور اس کا پتہ چل جاتا۔وقت کا پہیہ چلتا رہا دیکھتے ہی دیکھتے وہ طوفان تھم گیا۔جو اس سے پہلے آیا تھا۔اب لوگوں نے قیاس کیا کہ شاید اُسے وہ کسی بے نام قبر میں ابدی نیند سلا دیا گیا ہے۔مگر کہاں کس قبر میں؟اب تک یہ بھید عیاں نہ ہوا۔شاید کریک ڈاون یا چھاپے کے دوران گرفتار ہوکر جیل کی اندھیری کوٹھری میں طرح طرح کی اذیت ناک تکالیف اور ٹارچر سے دم توڑ بیٹھا ہو۔بہت سارے کم سن نوجوان مختلف نامعلوم جگہوں پر جس بُری طرح دفنا دیئے گئے ہیں اُس بربریت کے بارے میں کوئی ذی حس انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔اب جب کہ لگ بھگ دس سال کا لمبا عرصہ بیتنے کے بعد قیامت خیز موسمی آندھی دفعتاً تھم گئی تو اپنوں کی بازیابی کیلئے لوگ متحرک ہونے لگے۔حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آکر مظاہرے کرنے لگے۔لاپتہ نوجوانوں کے بارے میں جانکاری دینے کی مانگ زور وشور سے اُٹھنے لگی۔جو مارے گئے تھے ان کی بے نام قبروں کی نشاندہی اور شناخت بتانے کی مانگ بڑھنے لگی۔ان حالات میں جب کبھی نوری؟ بچاری نامعلوم قبروں کی بازیافتگی سے متعلق کوئی اشتہار دیکھتی تو اسے اپنا بیٹا ہاتھ میں پرچم لہراتا ہوا اجتماع میں شامل ہونے کا گمان ہوتا۔

آج کا اجتماع جو شہر کے ایک بڑے سے ہال میں منعقد ہورہا تھا۔اس کے متعلق سن کر وہ بھی اپنے سینے پر دکھوں کا بوجھ لئے ایسے ہی شہر چلی آئی شاید وہ اپنے غمگین شوہر کو اور غمزدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔جو دل برداشتہ ہوکر اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی خود اعتمادی ہی کھو بیٹھا تھا۔

پو پھٹتے ہی لوگوں نے ہاتھوں میں بینر اور گتے کے بورڈ لے کر اجتماع میں آنا شروع کیا تھا۔یہ اجتماع شہر کے عین وسط میں بنے ایک بڑے سے ایسے ہال میں رکھا گیا تھا۔جسے ایک صاحب ثروت نے قوم کے نام وقف کررکھا تھا۔اس ہال سے کبھی اس کے بیٹے کی زندگی کا تعلق بھی رہا تھا۔

کوئی دس سال قبل ایک دن اس کا بیٹا کریک ڈاون کے دوران پولیس کی گرفت میں دوران

تفتیش اتنا پٹ گیا کہ وہ جیل کی بند سلاخوں کے اندر ہی دم توڑ بیٹھا اور پھر دوسرے دن اس کی نعش اسی حال کے دروازے پر پڑی ہوئی پائی گئی۔ اولاد کے غم میں وہ ٹوٹ گیا اور ٹوٹ کر ایسا بکھرا کہ اس ہال کو بیٹے کے نام سے بے سہارا اور خستہ حال عوام کے لیے وقف کر دیا۔

ہال کے آنگن میں کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد و عورتیں سبھی شامل تھیں۔ جو مختلف اطراف سے آئے تھے۔ کچھ آس پاس کے علاقوں اور ملحقہ گاوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں چند چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ وقت مقررہ سے پہلے لوگوں سے بھرا ہال یوں لگتا تھا جیسے ساری آبادی اِدھر اُمنڈ آئی ہو۔ لہٰذا کافی شور و شر مچا ہوا تھا۔ چونکہ یہ عام اجتماع نہ تھا اسلئے چند اِکا دُکا ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ ملازمین، فوٹو گرافر اور پریس رپورٹر بھی واقعہ کو Cover کرنے آپہنچے تھے۔ پھر اچانک سٹیج پر ایک باریش بزرگ نمودار ہوا۔ جیسے ہی وہ مائک کے سامنے کھڑا ہوا سب کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ پورے ہال میں قبرستان جیسا سکوت چھا گیا۔ اگلی صفوں میں بیٹھی عورتوں نے زار زار رونا شروع کیا جیسے آہوں اور سسکیوں کا راج ہو گیا ہو۔ جیسے انسانوں کی بستی میں خوشی کا کال پڑ گیا تھا۔ ان کے پیچھے مردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد قطاروں میں بیٹھے سہمے سہمے سے حیران و پریشان سے تھے۔ بیشتر حضرات پُرنم آنکھوں سے اس بزرگ شخص کی تقریر بیقراری سے سُن رہے تھے۔ جیسے وہ سبھی اپنے ہی شہر میں اپنی بستی میں، اپنے گھر میں بے حال ہو کر اجنبیت سی محسوس کر رہے ہوں۔ بوڑھا بزرگ روہانسی آواز میں چپ رہنے کے لیے اپنے دونوں بازو ہوا میں لہرا لہرا کر خاموش ہونے کے اشارے کر رہا تھا۔ پھر ایک دم سارے مجمع پر خاموشی سی طاری ہوئی۔ سارے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب ہال میں صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس میں ایک التجا تھی۔ ایک عاجزی ایک درد تھا۔ ایک طوفان، ایک عجیب سی قسم کی گھٹن کیونکہ ماحول کو اس کی اثر انگیز جادو بیانی کی موٹی چادر نے جیسے ڈھک لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

تحقیقات کے بعد یہ حقیقت سامنے آسکتی ہے اور تحقیقات کا کام سرکار کے بجائے کسی با اختیار ایجنسی کو سونپی چاہیے۔ کیونکہ سرکار روزِ اول سے ہی ایسے معاملات کی سچی باتیں سامنے لانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ جہاں جہاں لوگوں نے نعرہ بازی کرتے ہوئے تحقیقات میں خدشات ظاہر کیے لاتعلقی کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا وہاں وہاں یا تو اندھا دھند لاٹھیاں برسائی گئیں یا پھر جھوٹی تسلیاں دے کر بہلائے گئے۔ ہم اپنے جائز مطالبات کو لے کر پُرامن احتجاج کر رہے ہیں اور یہ احتجاج تب

تک جاری رہیگا۔ جب تک سرکار ہماری مانگ پوری نہیں کرتی۔"

ہال کے ایک کونے میں نوری اپنے بدن کو سمیٹتی ہوئی بڑے ہی انہماک سے اس کی تقریر میں سچائی محسوس کررہی تھی۔ ہر سو خواتین سُن رہی تھیں۔ان کی آنکھوں میں لبالب آنسو ابھر آئے تھے۔ اس کے کتابی چہرے پر بکھرے ہوئے بال اس کی حالتِ زار کو صاف صاف بیان کررہی تھی۔اوراس مغموم چہرے کو دیکھتے ہی ایسا معلوم پڑتا جیسے وہ کسی ستم زدہ بستی کے اُجڑے لوگوں کے گھر کی ایک مثالی نمونہ ہو۔ یہاں جولوگ جمع ہوئے تھے۔وہ بھی اس کے غم واندوہ میں برابر ہی تھے۔ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی سوچیں کم وبیش مشترک ہیں۔شاید یہی خلش ، یہی تڑپ اور من کی ایسی ہی ہلچل ان سبھوں کو اِدھر کھینچ لائی تھی۔ان کی غیر ہوتی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

بزرگ اپنی بپتا سنارہا تھا۔اورلوگ بھی ہمہ تن گوش آنسوؤں میں لت پت اس کی روئیداد سن رہے تھے۔

"میرا بھی ایک بیٹا تھا۔ جو کبھی مجھے ڈیڈی اور کبھی بابا کے نام سے یاد کرتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے بزرگ پھوٹ پھوٹ کررونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے جی کا بوجھ ذرا ہلکا ہوگیا تو وہ پھر یوں بول پڑا۔ جیسے اس واقعہ کی تصویر اسکی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ہو۔ وہ بولا کہ "اچانک ایک دن ان کی زندگی میں ایک ایسا زلزلہ آیا۔ جس نے ساری خوشیاں تہس نہس کردیں"۔ ایسے ہی کئی واقعات جیسے ایک جوان کالج جارہا تھا۔ اچانک راستے میں گرنیڈ دھماکے کی زد میں آگیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اس کے ٹوٹے پھوٹے استخوان اکھٹا کرکے دفنادیئے۔ ماں بچاری کیسے جوان بیٹے کا جھٹکا سہہ پاتی۔ غموں کے پہاڑ کے نیچے دب کراپنا دماغی توازن کھوبیٹھی۔ پھٹے حال کھلی کھلی آنکھوں سے کبھی کھلے آسمان کو تکنے لگتی کبھی زورزور سے رونے لگتی تھی۔ بچارہ شوہر جوخود بھی جواں سال بیٹے کی ہلاکت پرٹوٹ کربکھر چکا تھا اپنی بیوی کی ہسٹریائی حالت دیکھ کردنیا کے سارے بکھیڑے بھول گیا۔ چونکہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پڑوسیوں اور رشتہ داروں نے ڈھارس بندھائی اور بیوی کی ناگفتہ بہ حالت کے دوررس نتائج کے بارے میں سمجھانا شروع کیا۔اور ایسے بہت سے گھرانوں کے نام زبان پر گنوادیئے جہاں والدین نے بیٹے کی میت کو کاندھا دیا تھا۔ جہاں ماں نے اپنی عصمت ریزی میں مری اپنی لڑکی کو خود غسل دیا تھا۔ ان عورتوں کے نام بھی لیے۔ جو بیاہی گئیں جن کے گھروں میں امیدوں کے چراغ

ہمیشہ کے لیے بجھ گئے۔ سب کچھ سننے کے بعد اپنے لیے نہ سہی، بیوی کی حالت سدھارنے کے لیے اس نے بھی احتیاطی تدابیر کرنا شروع کئی اور گھر سے مینٹل اسپتال کی چار دیواری میں منتقل کر کے اس کے علاج و معالجہ میں جٹ گیا۔

یہی کوئی آدھ گھنٹے تک، جب تک وہ بوڑھا بزرگ شخص اپنی مختصر و جامع تقریر کرتا رہا۔ وہ خیال میں الجھا رہا۔ تقریر اثر انگیز تھی۔ حیرت زدہ مضطرب بوڑھے کی آنکھوں میں اُداسی کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے اندر کرب کی لہریں شدت سے اٹھ رہی تھیں۔ وہ غم انگیز آواز میں بس بولے جا رہا تھا۔

مختلف عدالتوں اور کمیشنوں میں کئی اور شکایات درج ہیں۔ لیکن کوئی کاروائی عمل میں لائی گئی نہ ہی نامعلوم قبروں کی شناخت کرنے کا مرحلہ حکومتی اور انتظامی سطح پر روبہ عمل لایا گیا۔ بلکہ نظر اندازی کی پالیسی برابر برقرار رکھی گئی۔ جس کے باعث یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پھیل گیا ہے۔ آج کے جلسے کا مدعا و مقصد یہی کچھ بتانا تھا۔ اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بزرگ کو سن کر لوگوں میں ضبط اور برداشت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔ اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی یاد آتے ہی آہ و بکا سنائی دینے لگیں۔ کم و بیش سب کا یہی حال تھا کون کس کی مصیبتوں کو روتا۔ ہر ایک کی ایک بے عنوان کہانی تھی۔ ہر ایک اپنا غم سنا رہا تھا۔ ہاتھوں میں جو بینر اور گتّے کے بورڈ تھے۔ ان پر چسپاں تصویریں جیسے بول رہی تھیں۔ مگر ان میں کوئی اپنی بے نام قبر کے بارے میں نہ بتا رہا تھا۔ شاید انہیں بے وقت موت کا جیسے یقین نہیں ہو رہا ہو۔

نوری پچھاڑتی ہوئی بے حال ہو گئی تھی۔ وہ سینے سے اپنے بیٹے کی تصویر لگائے جیسے اس کی بالوں میں اُنگلیاں پھیر پھیر کر سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ اپنے شکستہ آنچل سے اس کے چہرے کو پونچھ رہی تھی۔ اچانک باہر ہال کے پولیس کی ہارن سنائی دی۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی جدھر جس کا رخ تھا اُسے ادھر کو بھاگنا پڑا۔ نوری کو کچھ چونکانے والی بات معلوم ہوئی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی۔ اچانک خطرناک بجلی کڑکی معلوم ہوتا تھا کہ قہر خداوندی شہر کو آفت زدہ کرنے پر تُلی بیٹھی ہے۔ مگر کارساز دو جہاں کی رحمت بھی نرالی ہے کہ بارش برس کر اچانک تھم گئی۔ بجلیوں کا کڑکنا بھی کم ہوا۔

لوگ دھکم پیل کرتے ہال سے باہر نکل چکے تھے۔اب اکیلی نوری وہاں رہ گئی تھی۔سر سے کمر تک اٹا ہوا ڈوپٹہ لپیٹ کر ہال سے باہر نکلی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔پولیس کا پہرہ لگا ہوا۔جا بجا پولیس گاڑیاں چوہے دان کی طرح لگے ہوئے جیسے چوہوں کو پکڑنے کے لیے تیار کھڑے ہوں۔

تارکول کی سڑک پر جمی گرد و غبار نے کیچڑ کی صورت اختیار کر رکھی تھی کہ چلتے ہوئے پھسلن ہو رہی تھی۔ایسے میں نوری کسی سڑک پر اوندھے منہ دھڑام سے گر گئی۔ بچاری...... ناتوان وجود بھر کم بوجھ کی وجہ سے کھڑی نہ ہو پا رہی تھی۔وہ کیچڑ میں لت پت ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر ہوش میں آتے ہی تھوڑی سے سنبھلی مگر لگتا تھا کہ جیسے دل کی دھڑکنیں رک سی گئیں ہیں۔ بیچارگی اور بے اختیاری کے عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ نکلے۔دور کہیں ہاتھوں سے بینر چھوٹ کر گرا تھا اور اُسے تلاشنے کے لیے ادھر ادھر غمناک نظریں دوڑائیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کیچڑ میں اٹے ہوئے اخبار کے تراشے اور ٹوٹے پھوٹے ادھ گیلے بینر...... ہاتھ لگے۔جن پر گم شدہ مدفون نوجوانوں کی تصویریں چسپان تھیں جو بھاگم بھاگ میں لوگوں کے ہاتھوں سے گر کر سڑک پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔اچانک اس کی نگاہ کچھ دور فاصلے پر اس جگہ ٹھہر گئی جہاں سڑک پر ایک بینر کیچڑ سے لت پت پڑا تھا۔پھر جونہی وہ آگے بڑھی اور اس بینر کو اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے کر دیا۔اسی لمحہ وہ بینر کسی بھاری بھر کم بوٹ تلے آ گیا۔

بینر پر جو تصویر چسپان تھی اب اس پر پڑے بوٹ کے تلوے کے نشانات اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور چیخ چیخ کر ناکردہ گناہوں کی داستان سنا رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں اب بھی ان سینکڑوں نوجوانوں کی لاشیں آہ و بکا کر رہی ہیں جنہیں تڑپا تڑپا کر جیلوں میں موت کی نیند سلا دیا گیا تھا اور پھر نامعلوم جگہوں پر بے نام و نشان دفنا کر نابود کر دیا گیا تھا۔تبھی تو آج تک ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا پاتا تھا۔

پھر جونہی نوری اٹھ کر کھڑی ہوئی تو سامنے ایک سپاہی کو خشمناک نظروں سے گھورتے ہوئے کھڑا پایا۔اس کی آنکھوں سے سفاکی برس رہی تھی اور ہاتھوں میں رکھی ہتھکڑی اس کی بے رحمانہ رویہ اور جبر و ستم کی داستان بیان کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ زہر کا گھونٹ پی گئی اور زیر لب مسکرانے لگی اُسے لگا جیسے ایک سزا کے بعد اب دوسری سزا دی جانے والی ہو۔

..................☆☆☆..................

ایصالِ ثواب

''منیم جی! آج صبح سے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں اُسے کلینک سے دوائی لے آنی ہے، پھر شام ہونے کو ہے گھر جلدی جانا ہے۔''

''تم کو باتیں بنانا خوب آتا ہے، دن بھر مکھیاں مارتا رہا، اب روز کی طرح کوئی نہ کوئی بہانہ......'' اچانک منیم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ باقی لفظوں کو نہ جانے کیا سوچ کر کڑوے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اتار دیا۔

منیم جی کی بطیعت الجھنے لگی۔

یوں تو صبح سے اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ اخباروں میں چھپی خبروں کے ساتھ ساتھ جب اس نے اسکولی بچوں کی کئی ٹولیاں پے درپے دکان کے سامنے سے گزرتی ہوئی دیکھی تھیں۔ وہ ہاتھوں میں بینر اٹھائے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ آج کا یہ احتجاج صرف ان دکانداروں کے خلاف تھا۔ جو ابھی تک اپنی من مانیوں سے باز نہیں آئے تھے۔

ٹھیک سامنے دکان سے لگی پٹری پر اسے ایک خوفناک سا بڑا کالا ناگ کنڈلی مارے اپنا پھن پھیلائے دکھائی دیا۔ حقیقت میں پرانے ٹاٹ سے لپٹا ہوا ایک وزنی بنڈل تھا۔ جسے ہر حال میں ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اکیلے ایک آدمی سے وہ اٹھایا نہیں جاتا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ شرارت بھرے لہجے میں اُسکو ٹوکتے ہوئے کہا۔

'کام چور! نکما کہیں کا! یوں اس طرح کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ فوراً کسی طرح اس بنڈل کو اٹھا کر کہیں کوٹھری میں ڈال دو۔''

''مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا۔ کافی بھاری لگتا ہے۔ دلاور خان کو آنے دو تو چٹکی بجا کر کہیں رکھ دوں گا۔''

''احمق! تو صرف بک بک ہی کرتا رہے گا۔ نہ جانے وہ کم بخت کہاں مر گیا کوئی نہیں

دے رہا ہے۔"

پچھلے پہر سے منیم جی کے چہرے اس وقت ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جب اُس نے دلاور خان کو کچھ کہے، پوچھے بنا ہی دکان سے نکل کر بچوں کے جلوس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جس نرم گداز گدی پر بے فکر اور آرام سے بیٹھا کرتا اُسے اس نشست پر کانٹے چبھنے لگے تھے۔ وہ بار بار اپنا پہلو بدلتا رہا۔ اس کا دماغ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ساجد علی اپنی پرانی پھٹی قمیض اور جینس پتلون پہنے ہوئے تھا۔ عجائب گھر سے چرایا گیا ہڈیوں کا پنجرہ جیسا بنڈل کے اوپر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ بار بار اپنے جسم کو آگے پیچھے ہلاتا گویا کسی جھولے میں ہچکولے کھا رہا ہو۔ ساجد علی کی عمر چودہ، پندرہ برس رہی ہوگی تناور کشمیری سفیدہ درخت جیسا اونچا قد رکھتا تھا۔

شہر کے نامور تاجر خواجہ بدرالدین کی دکان میں مزدور تھا۔ گھر میں اس کی چھوٹی چھوٹی دو بہنیں تھیں اس کا بوڑھا باپ کریم بٹ دمّہ اور کھانسی کے مرض میں بُری طرح مبتلا تھا۔ کئی سالوں تک وہ خواجہ بدرالدین کے پالی تھین کارخانے میں کام کرتا رہا۔ اچانک وہاں کارخانے میں خارج شدہ دھواں اور کیمیکل Chemical کے مُضر اثرات سے سینے کی پیچیدہ بیماریوں کا شکار ہوگیا۔ کافی علاج و معالجہ کیا مگر پھر بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اب آہستہ آہستہ اسکے مہینہ بھر کی کمائی دوا اور علاج میں لگ جاتی۔ کئی کئی دِنوں تک فاقوں کی نوبت بھی آجاتی۔ اگر چہ ساجد علی کی ماں پڑوس کے گھروں میں کام کاج کرتی۔ رات دیر تک چرخہ کات کر گھر کی معمولی ضرورتیں پوری ہوجاتیں۔ پھر بھی غریبی آسیب بن کر ستاتی رہتی۔ بگڑتی صحت کے پیشِ نظر کریم بٹ کو نوکری کو خیر آباد کرنا پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے ساجد علی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وہیں اس کی جگہ کارخانہ کی بجائے اسٹیشنری کی دکان پر کام کرتے کرتے اب تو لگ بھگ دو سال گزر گئے۔

کافی دیر تک منیم جی اس مخمصے سے نکل نہیں پا رہا تھا اور اُسے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں جا کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ دریں اثنا ساجد علی نے بھی اپنی جگہ چھوڑی تھی دونوں نے مل کر بنڈل پر پوری قوت آزمائی شروع کر دی۔ مگر نتیجہ بے سود ثابت ہوا۔ مایوس ہوئے منیم جی بڑ

بڑاتا واپس آکر اپنی گدی سے چپک گیا۔ساجد علی خاموش بے سدھ اُسے دیکھتا رہا۔

اچانک اسنے دلاور خان کو خواجہ بدرالدین کی کار کی پچھلی سیٹ سے اترتا ہوا دیکھ لیا۔تو اس کا دل اچھلنے لگا۔دیکھتے دیکھتے بنڈل کوٹھری میں آگیا۔

ابھی دو ماہ بھی نہ گزرے۔

سارا شہر سیلاب کی زد میں آگیا۔دیکھتے ہی دیکھتے پانی اپنے ساتھ سب کچھ خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

ایسے میں وقت نے کروٹ بدلی۔زمانہ بدلا۔خیالات بدلے۔سوچوں میں تغیر آگیا اور اچھے بُرے کی تمیز ختم ہونے لگی۔

چھوٹے چھوٹے اسکولی بچے،جوان مرد بوڑھے،سب اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔پالی تھین کے خلاف زوردار مہم سے متعلق خبریں اخباروں،میڈیا اور ٹی وی پر سنائی دینے لگی۔کئی سماجی کارکنوں نے اُسکو مضر اثرات اور جان لیوا بیماریوں سے بازیافت کردیا۔جلسے جلوس اور ریلیوں کا انعقاد کیا گیا۔جگہ جگہ پوسٹر بھی لگوادیئے گئے۔غرض شہر میں جتنے اس کاروبار سے تعلق دار کارخانے چل رہے تھے۔ایک ایک کرکے بند ہوئے یا ان پر تالے چڑھا دیئے گئے۔

خواجہ بدرالدین کی کیا اوقات۔اُسے بھی بدلتے دیر نہ لگی۔لوگوں کے تیور دیکھتے ہی کارخانہ کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگادیا گیا۔اب اس کی حالت ان سے کم نہیں پڑ رہی تھی۔جو بھی وہاں اس کارخانہ کے سامنے سے گزرتا تاک جھانک کیے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھری سے نہیں،خواجہ بدرالدین نے فوراً دوسری جگہ پر اپنے نام کی سٹیشنری کی دوکان کھول دی اور سٹیشنری کی آڑ میں گودام میں پڑا ہوا لاکھوں روپئے کا پالی تھیں خفیہ طریقے پر بیچنے لگا۔

سارا حساب وکتاب منیم جی کے ذمہ تھا۔دلاور خان گھر کا پرانا خادم اور قوی ہیکل شرافت اور لیاقت سے اُس نے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔گھریلو کام کاج کے ساتھ دکان پر بحیثیت سیلز مین کا کام انجام دیتا تھا اور ہر سیاہ وسفید کا خیال رکھا کرتا۔اس طرح دلاور خان کی حیثیت گھر میں اتنی اہم ہوگئی کہ داخل ہونے والے کو اس سے ملنا ضروری تھا۔

کسی کی کیا مجال تھی جو اس کے سامنے کسی معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ بات ساجد علی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ معمولی سی باتوں پر ان کے درمیان نوک جھونک کرنے کی عادت تھی۔ منیم جی نہ ہوتے تو بڑی مشکل سے یہ چنگاری بجھ پاتی۔ پرسوں ہی وہ دونوں کسی بات پر گتھم گتھا ہوئے۔ ساجد علی کے چہرے پر دو چار چانٹے پڑے۔ اف تک نہ کی۔ صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

موت کو کس نے ٹال دیا۔ مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر کریم بٹ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا زندگی کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ ہونے کے باوجود بھی پہاڑ کی طرح کھسک کر وہ ساجد علی کے کندھوں پر پڑ گیا۔ سارا دن دکان میں گم سم بیٹھا کرتا کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا۔

اب گھر میں بیٹھے بیٹھے ساجد علی نے کئی دنوں سے رو رو کر خود کو بالکل نڈھال اور پسپا کر دیا تھا۔ مسلسل رونے چیخنے سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک پھانس سی چھبتی رہی، دکھ ستا تا رہا، کئی بار اس نے اپنے پرانے جانے پہچانے دوستوں کو کالج جاتے ہوئے دیکھا تو عجیب سی دہشت نے جیسے گھیر رکھا تھا۔ وہ آٹھویں جماعت تک ساتھ ساتھ اکٹھے پڑھتے تھے۔ کئی بار جلوس کے سب سے آگے شعلے جگاتے ہوئے اشتعال دلا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُسے عجیب سی کمی کا احساس ہوتا تھا۔

لیکن اُس کا دوسرا لمحہ یاد کر کے اُسے مایوسی کے گہرے بادلوں میں چھپا ماضی کا چہرہ روتا بلکتا نظر آتا تھا مگر جلد ہی وہ کسی جذبہ ایثار اور خلوص پر یقین کر کے پچھلی ساری باتیں بھول کر ایک نئی زندگی جینے پر آمادہ ہو جاتا۔

کئی دنوں سے ساجد علی کو ایک انوکھے خواب نے جگا رکھا۔ اب وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دوسرے دن دکان کی بجائے شہر کے تھانے پر آ گیا۔

خواجہ بدرالدین کے گودام سے متعلق ساری تفصیلات دیتے ہوئے بند بوریوں اور بنڈلوں میں پالی تھین کا ایک بڑا ذخیرہ ہونے کا انکشاف کیا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے ساجد علی کو ایسا لگا کہ شاید وہ یہ عظیم فریضہ اپنے مرحوم باپ کریم بٹ کے "ایصال ثواب کے لئے کر رہا ہوں!!!"



''پانسا''

ساٹھ سال۔!

ایک طویل سفر......ایک لمبا سفر!

وقت کب دبے پاؤں گزرا۔ اسے اتنا بھی پتہ نہ چلا اور نہ ہی اس کا احساس ہوا۔

لوگوں نے رائے قائم کرلی تھی کہ کہیں ایسا شخص ملکوتی صفات سے تعلق ہی نہ رکھتا ہو۔ اپنی 35 سالہ نوکری کے بعد وہ باعزّت طور پر سبکدوش ہوگیا۔ بظاہر اس کے لئے ایک مشکل اور دشوار گزار مرحلہ تھا۔ کچھ ذمہ داریاں اور مجبوریاں دیواروں کی طرف حائل تھیں مگر ان دشواریوں سے ہاتھ کھینچ لینا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی اس کے مزاج و رویہ اور تیور میں کوئی بدلاؤ نہ آیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس عمر میں بھی بالکل ویسا ہی ساٹھا پاٹھا لگ رہا تھا۔

اپنی سروس کے دوران وہ ایک کلرک ہی رہا۔ ترقی کے منازل ملے کرتا ہوا جونیئر سے سینئر، سینئر سے ہیڈ کلرک کے عہدے پر تعینات ہوا۔ ہر پرموشن ہونے کے بعد اس کی تبدیلی متواتر ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں ہوتی رہی۔ بالآخر وہ اس مقام پر آگیا جہاں اس کی نوکری ریٹائرمنٹ کی شکل میں بے وفا محبوبہ کی طرح دغا دے گئی۔ سنا ہے کہ ایسی نازک گھڑی میں بڑی مشکل سے ملازم سنبھل پاتے ہیں، وگرنہ انہیں ذہنی خلل کا احتمال رہتا ہے۔ لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس موقع پر وہ صاف طور بچ کر نکل گیا۔

پہلے پہل اس نے ریٹائرمنٹ کی بات اپنے عزیز واقارب سے چھپائی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اللہ میاں جھوٹ نہ کہلوائے اسے۔ شاید یہی سوچا ہوگا کہ سن کر بھی وہ کیا کر سکتے؟ زیادہ سے زیادہ اس کی ڈھارس بندھاتے یا پیٹھ پیچھے اُسکی پنشن کا حساب لگاتے۔ آخر کب تک بات چھپی رہتی۔ وہ تو ہوا میں غبارے کی طرح اُڑی۔ اس طرح اس نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

سچ بات تو یہ ہے وہ ہمیشہ بڑی ایمانداری اور جانفشانی سے دفتر میں کام کرتا رہا اور چھوٹی سی

تنخواہ پر گزارہ کرتا رہا۔

شرافت کا حال کہ آج تک کسی کے سامنے رشوت کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ حرص ولالچ میں آ کر اپنے ضمیر کا خون ہونے دیا۔ اس بات کا قائل تھا کہ گھر کی آدھی نہ کہ باہر کی ساری پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزار دی۔ مانا کہ اس عمل میں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھانے میں ناکام رہا۔ مگر دوسروں کی خاطر دنیا بھر کا سکھ چین، آرام اور خوشی تیاگ دی۔ گویا اس کا ہر لمحہ ہر کسی کے لیے وقف تھا۔ مشہور کہاوت ہے کہ بیکار آدمی کا دماغ ابلیس کا گھر ہوتا ہے۔ اس بات میں کس قدر صداقت ہے۔ نجم الدین نے اپنے گھر میں ہی اپنے لئے ایک چھوٹا کمرہ منتخب کر لیا۔ جہاں سے اس کی نظریں لان سے گزرتی ہوئی بیرونی دروازے پر جا کر ٹھہر جاتی۔ ہر آنے جانے والے کو خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا۔

صبح ہوتی تو سورج کی اُجلی اُجلی روپہلی کرنیں شیشہ لگی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر آتیں اور شام کو ٹھنڈی تیکھی تیز ہواؤں سے گھبرا کر اپنے وجود کو سمیٹتی ہوئی لوٹ جانے کے لئے اٹھ کر چلی جاتی، پٹ کھلے ہوں تو خوشگوار ہوا کے جھونکے آتے رہتے۔ کھڑکی کے نیچے لکھنے کی میز تھی۔ میز کی صفائی خود کرتے اور چیزیں اپنے حساب سے ترتیب دیتے تھے۔ فرش پر ادھر ادھر بند کتابیں اور رسائل بے ترتیب پڑے رہتے۔

چونکہ اس کا سارا وقت خالی خالی رہتا۔ اس لئے وقت گزاری کے لیے لکھنا پڑھنا مناسب سمجھا۔ اس طرح اس نے اخباروں اور جریدوں کے لئے لکھنا شروع کیا۔ شروعات میں افسانہ نگاری کا مشغلہ اپنا لیا پھر تو جیسے یہ سلسلہ چل سا پڑا۔

آج نجم الدین کمرے میں بالکل اکیلا بیٹھا، سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید کسی کہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیروں سے پتہ چلتا تھا کہ کہانی کے لئے تمہیدی جملوں کے لیے ایسے موزوں الفاظ مل نہیں پا رہے جنہیں پڑھتے ہوئے قاری کو پتہ لگتا کہ افسانہ نگار کا ہنر بول رہا ہے۔

کب اور کس نے چپکے سے دروازہ کھولا، ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی پاس آ کر دھیمی دھیمی آواز میں کھنکارنے لگی۔ ایکا یکی اس کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چونک سا پڑا، جیسے کسی خاموش جھیل میں کوئی بھاری پتھر گرا دیا گیا ہو۔ کسی کو اس طرح سامنے پا کر نجم الدین لمحہ بھر متحیر ہو کر رہ گیا اور اس کا آنا توقع کے خلاف محسوس ہوا۔ وہ اسے کوئی ایک ہفتہ پہلے بازار میں ملی تھی۔ نجانے آج کیوں

بیزاری کا احساس اندر ہی اندر کریدتا ہوا گزرتا گیا۔ جس کا برملا اظہار کر نہ سکا......اور آنے کا سبب پوچھنے کی ہمت جٹا پایا۔

''السلام علیکم''۔ وہ آہستہ سے بولی۔ بھیگی بلی کی طرح اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی پھنسی پھنسی سی آواز کسی گڈھے کے اندر سے آتی ہوئی لگی۔

''کیسی ہو اور کیسے آنا ہوا؟''۔ نجم الدین نے خیر و عافیت کے بہانے چہرے پر اپنی خفگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیسی نظر آئی ہوں''۔ اس جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

''شاید روٹھ کر چلی آئی ہو۔ تمہارے اُترے اُترے چہرہ سے یہی اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے۔''

''ہاں۔ اُس نے آج ایک اور جھمیلا کھڑا کیا''۔ اس بار اس کی زبان میں ذرا سی لکنت آ گئی۔ ساتھ ہی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور حالات یہی بتا رہے تھے کہ اس بار......

واقعی اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اس کا کتابی نکھرا نکھرا چہرہ بے رنگ تھا۔ گویا چہرے کے اندر دھنسی دھنسی آنکھوں میں حسرت آلود کائنات تھم گئی ہو۔ ایک انجان خوف نے وہاں اپنا ڈیرہ جما رکھا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہی۔ اس کی زبان چپ ہو گئی۔ شاید اپنے آپ سے ہار چکی تھی اور ٹوٹ چکی تھی۔

نجم الدین صرف اسے خاموش دیکھتا رہ گیا۔ کچھ نہ بولا پھر نہ جانے کن بھول بھلیوں میں ڈوب گیا۔ شاید ابھی تک وہ اس کے اُن الفاظ کو بھول نہ پایا تھا کہ ''دوبارہ اس نے اس قسم کی بزدلانہ حرکت کی تو مجھ سے بری کوئی نہ ہوگی۔ تو میں......''

نجم الدین سوچنے لگا کہیں اس کی سادگی شرافت اور شائستگی پر دھبہ نہ لگ گیا ہو۔ پچھلے تین مہینوں سے اس نے نجم الدین کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

اب ہر بار وہ اپنا دکھڑا سناتی رہتی اور اپنے خصم کے خلاف زہر اُگل دیتی تھی۔ پچھلی بار جب وہ جانے لگی۔ جاتے جاتے طیش میں آکر دھمکی چھوڑ گئی تھی۔ بار بار نجم الدین کے کانوں میں یہی الفاظ گونجتے ''دوبارہ اس نے اس قسم............'' اس میں شک نہیں کہ نجم الدین نے اسے لاکھ سمجھایا، یقین دلایا اور ازدواجی زندگی کے پاک رشتے کی سلامتی کی دعائیں بھی دیں۔

نجم الدین نے نیلوفر، جسے سب نیلو کہتے ہیں، کی بات کا کوئی بُرا نہ مانا مگر شک کا کیڑا اپنی جگہ کام کر گیا تھا۔ رشتہ میں وہ اس کے مرحوم منجھلے بھائی کے اکلوتے بیٹے کی بیوی اور اس کی بہو تھی۔ ہمیشہ اپنے شوہر آصف میاں سے لڑنے جھگڑنے کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ سچ یہ ہے پچھلی دفعہ وہ اپنی زبان درازی سے پٹ گئی تھی۔ آصف میاں نے اتنا مارا کہ جان کے لالے پڑے، نجم الدین کے پاس دوڑی چلی آئی، شکایتوں کا پٹارا کھول کر بیٹھی۔ ناگن جیسی پھن پھیلائے چہرہ گلنار ہو گیا۔

شادی کو پندرہ سال ہوئے اور اس دوران تین بچے پیدا ہوئے تھے۔ پھر بھی کسی دوشیزہ سے کم دکھائی نہ پڑتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اس طرح گھل مل جاتی کہ ہر کسی کا دل موہ لیتی، لیکن پچھلے کئی سالوں سے اسے اپنے گھر میں نند کا آنا اچھا نہیں لگتا تھا، دیکھتے ہی سرد مہری دکھاتی اور کوئی نہ کوئی بہانا ڈھونڈ لیتی۔ طعنوں اور کوسنوں سے نوازتی۔ جو گھر ایک زمانہ میں اس کی نند کا آرام گھر، جنت کا گھر تھا، جہاں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی، جوان ہوئی۔ وہی اب اس کے لئے جہنم بنا دیا تھا۔

نیلوفر کے من میں کھوٹ تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ آصف اپنی بہن اور بھانجے پر پانی کی طرح روپیہ بہا دیتا ہے۔ اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کر دیتا ہے جبکہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی گئی تھی، جہاں اُسے ہر قسم کی سہولتیں میسّر تھیں۔

نیلوفر بھائی کو بہن سے برگشتہ کرنا چاہتی تھی۔ اس عجیب منطق میں آصف میاں الجھن میں پڑا ، نیلوفر کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اب اگرچہ آصف کی بہن اور نیلوفر کی نند ایک بچہ کی ماں بھی بن گئی لیکن رقابت کی آگ تھی کہ ٹھنڈی نہیں پڑی تھی۔

آج نیلوفر جی بھر کے رونا چاہتی تھی اور اس نے آہستہ آہستہ رونا شروع کر دیا۔ یہ آنسو نمائش تھے یا غمگساری کے۔ نجم الدین اس بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اب تک اس کے آنے کی خبر گھر کے کسی فرد کو نہیں ہوئی تھی ورنہ ایک اچھا ماحول وہ بگاڑ کے رکھ دیتی۔

نجم الدین یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ضرور کوئی انہونی بات ہوئی ہے ورنہ کیوں وہ آج دوبارہ میرے پاس آ کر چولہے پر چڑھی ہانڈی میں اُبلتے ہوئے آلو جیسی سی سی کی آواز نکال لیتی۔ بات کچھ ایسی ہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس وقت کوئی بھی اندازہ لگا سکتا کہ کوئی اس کی ہنسی چھین کر لے گیا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ یا زبردستی کی گئی ہو۔

پچھلے کئی مہینوں سے میاں بیوی کے درمیان جو کچھ چل رہا تھا اس میں انہوں نے ایک

دوسرے کے خلاف شکایتوں کا ایک محاذ کھولا تھا جو آہستہ آہستہ ازدواجی زندگی کے تعلقات میں رائی کا پہاڑ جیسا حائل ہو گیا تھا، کسی حد تک نجم الدین نے حالات کو معمول پر لانے کے لئے کافی کوششیں کیں۔ایک دوسرے کے روبرو صلح وصفائی کی تدبیریں اختیار کیں اور آپسی رنجشیں رفع دفع کرا ئیں اور معاملہ درست کیا۔مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ کنوئیں میں مینڈک چھپا ہوا بیٹھا ہے۔

نیلوفر سسکیاں لیتی رہی۔اس نے چمڑے کا پرس کھولا، کانپتے ہاتھوں میں ایک پرچہ ہاتھ میں آیا اور نجم الدین کو پکڑا دیا۔ایسا کرتے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

نجم الدین پرچہ ہاتھ میں لئے تجسس بھری نظروں سے اُسے پڑھنے لگا۔پڑھ کر تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ عامیانہ باتیں اتنی طول پکڑ لیں گی۔گھٹی سانسوں کا بوجھ لیے وہ ابھرتا ڈوبتا اور سوچتا رہ گیا۔اس کا دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔کئی بار سمجھا کر تھک چکا تھا۔میاں بیوی کا رشتہ کتنا عجیب رشتہ ہے۔زندگی بھر ساتھ دینے کا عزم، وعدے نبھانا، غرض ارادھنا، پراتھنا اور واسنا کا دوسرا نام ازدواجی زندگی ہے۔

نیلوفر اسکے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھتے ہی سوڈاواٹر کی طرح اُبل پڑی۔

''اب یقین ہو گیا۔میری پندرہ سالہ رفاقت کا اس نے خوب صلہ دے دیا اور اپنی اوقات پر اتر آیا''۔

''کل شام جس وقت میں دفتر سے لوٹ کر آرہی تھی اُسی وقت یہ ملا'۔

''کسی کو بتایا؟'' نجم الدین کا اگلا سوال تھا۔

''ابھی تک کسی کو بتایا نہیں مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' نیلوفر بے ٹوک اپنا ارادہ ظاہر کر گئی۔

وہ دیر تک نیلوفر سے کیا کیا معلومات حاصل کرتا رہا۔ایسا لگ رہا تھا جسے وہ پرچے میں لکھی ہوئی عبارت کے منحوس الفاظ کے شکنجے میں پھنس گیا ہو، جس سے باہر نکلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا، وہ بڑبڑاتا رہا۔ ''کم بخت اس نے نہ صرف میری عزت داؤ پر لگائی بلکہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے پڑھا لکھا ہو کر گنواروں اور جاہلوں کی طرح سوچتا ہے۔قانون کے داؤ پیچ اور کوٹ کچہری کی کارروائیاں کیا جانے وہ......'' پھر کچھ توقف کے بعد بولا

"بادل گرجے بارش نہیں ہوتی۔ لگتا ہے تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوگی۔ اس طرح نادانی کرتی رہو گی تو بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ میری مانو صبر سے کام لو ابھی۔" نجم الدین نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ حقیقت میں وہ بھتیجے کے مزاج سے باخبر تھا مگر اس کی باتوں میں طرفداری کا عنصر کہیں کہیں ضرور موجود تھا۔

"میں پچھلی بار آپ کو آگاہ کر چکی ہوں کہ اس کے ارادے ٹھیک نہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ کسی نزدیکی پولیس اسٹیشن جا کر اس کے خلاف رپورٹ لکھواتی۔ شاید اس کا دماغ ٹھکانے لگ جاتا"۔ نیلوفر ایک سانس میں بولی۔ اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کے پیچھے کوئی عزم یا گھمنڈ بول رہا ہو۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اتنا گر سکتا ہے۔ شاید وہ کسی کے بہکاوے میں آ کر پاگلوں کی طرح اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ تھوڑی سی مہلت دو، میں اس کی خبر لوں گا"۔ اچانک نجم الدین کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے"۔ نیلوفر نے دوٹوک جواب دیا۔

اسے نیلوفر کا لہجہ کافی غصیلا لگا۔ جیسے منوں بھر آتشی ڈھیر کو تیلی لگنے کی دیر تھی۔ کسی بھی وقت بھڑک اُٹھے۔ چند ساعتوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی جیسے کسی طوفان کے آنے سے پہلے ماحول میں تناؤ رہتا۔

"دیکھو نیلو! اتنی آپے سے باہر نہ ہو۔ یہ تو صرف عدالتی نوٹس ہے"۔

"نہیں! اب تو حد ہو گئی ہے۔ آج عدالت کی طرف سے طلاق رجعی دی کل تو وہ سہ طلاق دے سکتا ہے۔ میں اپنے بچوں کا گلا کیسے کاٹ دوں۔ نجمہ بڑی ہو گئی ہے۔ سلمیٰ ابھی چھوٹی ہے اور یونہی چھوٹو کی زندگی تباہ و برباد نہیں ہونے دوں گی۔ ابھی نچلے کلاسوں میں پڑھتے ہیں بڑے ہو کر......" یہ کہتے اس کی آواز حد سے زیادہ گلوگیر ہو گئی۔

"ابھی معاملہ بگڑا نہیں ہے، صلح صفائی سے تمام پیچیدہ مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ ہر حالت میں کوشش اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"اب وہ زمانہ نہ رہا کہ مرد عورت کو جوتی سمجھ لے اور جب دل چاہے اسے بدل دے۔ اس کے ظلم و ستم اور گالیاں سہہ لیں۔ قانون خواتین کا ہے کہ تحت اس کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے کوئی

روک نہیں سکتا مجھے۔'' قے آتے آتے نیلوفر کے معدے سے سارا کچرا باہر نکلا آیا اور خود بخود شانت ہونے میں بھی دیر نہ لگی۔

''تم جس ایکٹ کے متعلق بات کر رہی ہو وہ غلط سمجھ چکی ہو۔ آزادی کا مطلب یہ کہ عورت کو بھی چھوٹ دی گئی ہے۔ اس معاملے میں سماجی اور مذہبی بنیادوں کی پاسداری کا خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ اس کی حیثیت ایک بے لگام گھوڑی جیسی ہو کر رہ جائی گی''۔

یہ کہتے نجم الدین کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ گھر کی بات تھی گھر کی دہلیز سے باہر جانے، کیسے گوارہ کر لیتا۔ ناسمجھ اولاد تھی۔ خاندانی وقار کا سوال تھا۔ اس نے اس کی باتیں کڑوے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اُتار لیں۔

دوسرے لمحے نیلوفر کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ سارے جہاں کا درد اور کرب سمٹ کر اب ڈستے بغیر کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی کمرے سے وہ باہر نکل گئی۔

نجم الدین پریشان ہوا جا رہا تھا۔ وہ دو زندگیوں کو طغیانی کے حوالہ کر کے انہیں ڈوبنے سے روکنا چاہتا تھا۔ ان کی دنیا میں اجالوں کی خاطر دوسرے دن آصف سے ملنے کے لئے اسکے گھر جانے پر مجبور ہو گیا۔

یہاں آکر اسے نہایت کوفت اٹھانی پڑی۔ نیلوفر کی بہت سی باتیں پانی پر تیرتے برفانی تودے جیسی لگیں۔ آصف نے بہت سے اعتراضات اٹھائے جس کے دفاع میں کئی بار نیلوفر کی زبان لڑکھڑا ئی اور پاؤں ٹک نہیں پائے۔ روٹھ کر اب وہ میکے میں آصف کے خلاف بے بنیاد الزام تراش کر اُسے بدنام کر رہی تھی۔ دھمکاتی رہتی اور اسے ہراساں کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔

سارا ماجرا سمجھ کر نجم الدین چکرا گیا۔ کوئی فیصلہ نہیں لے رہا تھا۔ کافی دنوں تک سوچ بچار کیا۔ میاں بیوی کو سمجھاتا رہا۔ زندگی کے داؤ پیچ اور بچوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جانے پر تشویش ظاہر کی ۔ نئے سرے سے زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتا رہا لیکن معاملہ جوں کا توں کھٹائی میں پڑا رہا، جو کسی بھی وقت بھیانک رُخ اختیار کر سکتا۔

چاچا بھتیجے میں بہت دیر تک گفتگو ہوئی تھی۔ نجم الدین نے ترکش میں جمع تیر ایک ایک کر کے خالی کئے۔ لیکن ہر بار آصف اس کے وار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا جن سے نجم الدین کے منہ کا ذائقہ بھی بدل گیا۔ کہتے ہیں نا ''بکری چلی گئی پر ملی نہ گیا''۔ نادیہ میں آکر آصف کے لئے اسے بھی دو

ٹوک الفاظ میں متنبہ کیا۔

''بہتر یہ رہے گا کہ آپ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کریں۔ یہ معاملہ پتی پتنی کا ہے۔ چاہے اسے کورٹ کچہری ہی کیوں نہ لے جانا پڑے۔''

''جیسی تمہاری مرضی!''...... یہ کہہ نجم الدین دم سادھے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

چند دن یوں گزرے، جیسے کئی صدیاں بیت گئیں ہوں۔ نجم الدین کو آصف کی باتوں پر قلق ہوا اور اس کے برتاؤ پر ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ دل کو ایک گہری چوٹ لگی، خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اچانک ایک دن نیلوفر دوبارہ کمرے میں نمودار ہوئی۔ نجم الدین کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب اس نے نیلوفر کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ آتے ہی اس نے بتا دیا۔

محلے کے کچھ پنچ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ہمارا سمجھوتہ کروالیا ہے۔ آصف نے طلاق رجعی جو دیا تھا وہ واپس لے لیا ہے۔ اب میں ایک دو دن کے بعد گھر جانے کے لئے تیار ہوگئی ہوں۔

یہ سنتے ہی نجم الدین خوشی سے اچھل پڑا اور دل ہی دل میں اپنے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر لمحہ بھر سوچ کر وہ بڑبڑاتا رہا۔

مانا کہ میری شرافت سے میاں بیوی کی آنکھوں کی جوت جگمگائی اور مجھے ان کی باتوں اور رویہ سے جو درد ملا تھا۔ دیکھئے ان مصیبتوں کا انت ہو گیا۔ ساتھ ہی افسانہ کے لئے ایک اچھا پلاٹ بھی مل گیا۔ البتہ ڈر تو اس بات کا کہیں آئندہ پانسہ پلٹ نہ جائے۔

..................☆☆☆..................

تکونی زاویئے

اُس نے کئی تصویریں خریدیں......

اپنے کمرے میں آکر دوبارہ چھانٹنے میں مصروف ہو گیا......ان میں ایک تصویر کا انتخاب ہوتے ہی اُسے علیحدہ کر دیا۔ باقی ماندہ تصویروں کو دیوار پر جگہ جگہ چسپاں کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے دیوار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور چند لمحے سوچنے کے بعد وہ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ شاید ہلکی سی تکان کا احسان ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کیا۔

دیوار پر مختلف پوزوں میں لی گئی تصویریں دیکھنے والے کو استعجاب کے عالم میں ڈبو دیتیں۔ ان گنت نامعلوم تصویریں ایک البم سے کسی طرح بھی کم نہیں تھیں۔

ان میں اُن عورتوں کی تعداد بھی خاصی ہوتی جو اپنی گود میں کوئی گول مٹول سا شیر خوار بچہ لیتے ہوتیں۔

پرانی تصویروں کو ہٹانا اور ان کی جگہ نئی نئی تصاویر کو ٹانگ دینا اب اسکی فطرت کا ایک جز بن کر رہ گیا۔

شاید اس طرح وہ قلبی سکون پانے کی ایک ناکام سی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی تصویر پر اسکی نظر پڑتی تو جذبات سے مغلوب ہوتے ہی وہ اسکی خواب گاہ میں ٹنگ جاتی۔

کسی ناکام مصور کی آرٹ گیگری میں غیر مبہم سینکڑوں چہروں میں وہ انہیں کسی جانی پہچانی صورت سے موازنہ کرتے ہی ایک جیسے رنگ وروپ میں پاتا۔ تب اسکو محرومی کا احساس بار بار اُسے مایوسی کی کھائی میں دھکیل دیتا۔

پلنگ پر پڑی ہوئی تصویر کو کانپتے ہاتھ میں آنے کی دیر ہوئی۔ اس کے البم میں فوراً کسی کی دھندلی سی شبیہہ گزر گئی۔ دل میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ بے بسی کا درد آنسوؤں بن کر پلکوں پر اتر آیا۔ چند قطرے آنسوؤں کے اسکی گھنی داڑھی میں گھل مل گئے اور چند قطرے تصویر پر بھی آگرے اور رخساروں پر باریک سی لکیریں چھوڑ گئے۔

کب سے یونہی ہاتھ میں گول مٹول چہرے پر ہلکی سی مسکان لیے اور چاکلیٹ میں ڈبویا جیسا ننگے بدن، ہی ایک معصوم بچے کی تصویر کو وہ غور سے دیکھتا رہا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بار بار اُسے چومتا رہا۔ پیار کرتا رہا۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے اسکے سامنے ماضی کی ایک تلخ حقیقت سے بھری ایک مکمل کتاب کھلی پڑی ہے۔

تعلقات کب کے منقطع ہو چکے تھے۔

پاک رشتے کے درمیان میں ایک آہنی حصار لا کر کھڑا ہوا تھا...... اگر چہ شاذیہ کے چلے جانے سے اسکی محرومی سے کئی سالوں تک اسکا وجود مطلق اثر انداز نہیں ہوا اور اس سے ملنے کا اسکے دل میں کوئی جذبہ بھی پیدا نہ ہوا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اسکے خیال اور جذبہ کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری تھی۔

قلیل سی مدت میں ہی اپنے خول سے باہر آ گئی۔ غیر مانوس کلمات اور جاہلانہ وطیرے سے گھر کا شیرازہ بکھرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور دونوں میں آخر جدائی ہو گئی۔

کئی دہائیاں گزر گئیں ...... جب شاذیہ اسکے گھر میں دلہن بنکر آئی تھی۔ وہ حسن کا ایک قیامت خیز پیکر ...... حسن کی ایک دیوی جو عالم شباب سے سرشار منچلے خوابوں کی ایک حسین تعبیر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اور وہ خود بھی سڈول اور بھرے جسم کا مالک ایک تیس سالہ نوجوان تھا...... اس کے آنے سے کتنی ہی اُمیدوں اور ارمانوں کے دیوان کھل گئے۔ خوشی اور انبساط کی نرم نرم کونپلیں کھل اٹھیں۔ اور اس طرح کئی سال موج مستی اور ہنسی خوشی سے کٹ گئے کہ وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

ایک اچھا خاصا گھر تھا...... ہر قسم کے تفکرات سے پوری طرح آزاد...... ایک اچھے گھر کی طرح کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ چار پانچ ہزار روپے ماہوار آمدنی۔ سر چھپانے کے لئے چار متوسط درجے کے کمرے۔ ایک اچھا خاصا کچن اور............

انگلیوں پر گنتی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ ایک نیک سیرت بوڑھی ماں کی سرپرستی اُسے حاصل تھی۔

اسکے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ جو کئی سال قبل اسی شہر میں دوسری جگہ منتقل ہو چکے تھے البتہ فرصت کے لمحات میں اپنی بوڑھی ماں کے پاس چلے آتے۔ خیر و عافیت پوچھنے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ بچوں کی تعلیم۔ ان کی صحت اور کاروبار کے متعلق باتیں ہوتیں...... غرضیکہ ہر قسم کے موضوع زیر بحث آتے۔

"بہن مریم بھی اسی شہر کے ایک متوسط گھرانے میں بیاہ کر گئی تھی۔ اس کا آنا بھی آتے

میں نمک کے برابر ہوتا۔لیکن جب بھی اس کا گزر ہوتا۔وہ اپنے دونوں بچوں کی انگلی پکڑے میکے کے برآمدے میں نظر آتی۔اور بوڑھی ماں کے سامنے پوٹلی میں جمع شدہ کہانیوں کے ڈھیر لگ جاتے۔جن کا کلائمکس دوسری بار اس کے آنے اور انہیں سنانے کے بعد تمام ہوتا۔

چونکہ یہ عادت فی زمانہ عورتوں کو ورثہ میں ملی ہے۔لہٰذا انکو سننے سے کون انکار کرتا۔

یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔جب تک بوڑھی ماں حیات رہیں۔

کیلنڈر کے صفحات بدلتے رہے۔

شاذیہ نے حروف کے اعداد میں اس کمی کو دور کرتے ہوئے ایک نئے عدد سے اُسے پورا کر دیا اور وہ ایک بچہ کی ماں بن گئی۔اس کی ننھی ننھی سی مسکان سے گھر میں روٹھی خوشیاں واپس لوٹ آئیں۔ آرزوں کے نئے باب کھل گئے۔اُمیدوں کی قندیلیں روشن ہوگئیں۔جیسے جیسے وقت گذرتا رہا۔بچہ پروان چڑھتا رہا۔

وقت کے پنچھی کو آج تک کوئی قید نہیں کر سکا اور نہ ہی انہونی کو کوئی ٹال سکا۔جس منحوس خبر نے سب کی کمر توڑ دی۔مریم کے شوہر کا ایک کار حادثہ میں انتقال ہونے کی خبر تھی۔

گھر کے ہر فرد پر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔گھر کا ہر فرد ماتم میں ڈوب گیا۔

ابھی بہنوئی کے انتقال کو محض کچھ ہی دن گزرے تھے۔سارے زخم تازہ تھے۔بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ زخم ابھی رس رہے تھے۔

ہر آنکھ اشک بار تھی۔جذبات نم ناک تھے اور خیالات مجروح کہ اچانک ایک نئے راز کا انکشافات ہوا۔

اس راز نے تو گویا زخموں پر تیزاب کا کام کیا۔ایسا سننے میں آیا کہ اس حادثہ سے چند روز قبل وہ اپنا آبائی مکان فروخت کر چکے تھے اور کسی نئے مکان کی تلاش میں سرگرداں ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔

سارے سودے ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔

آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمتوں کے سامنے ان کی تھوڑی سی پونجی قوت خرید سے بہت کم معلوم پڑتی۔شاید اسی الجھن سے نجات پانے کے لئے انہوں نے اپنی جان گنوادی ہو۔اور دیکھتے ہی دیکھتے مریم بھی فٹ پاتھ پر آگئی۔

وہ کب تک یہ سارا تماشہ دیکھتا رہتا۔اس سے مریم کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔وہ اُس

بات پر بار بار اصرار کرتا رہا کہ مریم اپنے دونوں بچوں کو لے کر اس کے گھر میں آجائے۔

عزیز واقارب کے پاس امید کا دامن پھیلا کر منت سماجت کا ایک دُور چلا لیکن ان کی طرف سے حیلے اور بہانے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اگر کسی نے تھوڑا بہت قرض دینے کی حامی بھرلی تو اسکے ساتھ شرائط اتنی سخت لگادیں کہ یہ خیال ہی ترک کر دینا پڑا۔

واقعی قرض کی ادائیگی کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ نوعیت کا تھا۔ ایک غموں کی ماری بیوہ عورت کیا کرسکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دونوں بچوں کو اسکول سے اٹھا کر کسی کارخانے میں بھیجا جاسکتا تھا...... اس طرح سے تھوڑی بہت کفالت ہوتی۔ گھر کے اخراجات پھر بھی پوری نہیں ہوتے۔ جس سے قرض خواہوں کے تقاضے کم ہونے کے بجائے شدت کر لیتے لہٰذا کوئی بھی موجودہ صورت حال میں قرض دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اگرچہ گاؤں میں چند ایکڑ زمین جو اجداد کی ملکیت اور ورثہ میں ملی تھی۔ اُسے بھی خریدنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا۔ اب اگر کسی نے دبے لفظوں میں خریدنے کی خواہش ظاہر کردی۔ تو وہ ایک گندی گالی ہوتی۔ اُمیدوں کے تمام دروازے بند پڑے دکھائی دیتے گویا ان پر آہنی تالے چڑھے ہوں۔

بے بسی اور نا اُمیدی کی چادر گھنی ہوتی جارہی تھی۔ اور اس کا دم گھٹتا جارہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمتّ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

چاروناچار کافی تگ ودو کے بعد گاؤں کی زمین بنک میں گروی رکھ کر قرضہ لینے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنے کھاتے میں سے بچی ہوئی رقم بھی ملادی۔ اور مریم کو ایک چھوٹا سا گھر دلادیا۔ شاید اس میں اپنی ماں کی نصیحت کا اثر بھی تھا یا اپنی بہن کے تئیں اپنی فراخ دلی......

نئے مکان میں آتے ہی پرانی چیزوں کی مرمت شروع ہوئی۔ پرانی دیواروں پر ڈسٹمپر کی شروعات ہوئی نہ جانے کس طرح گھڑی کی سوئیوں پر ہلکی سی گرد کی تہہ چڑھ گئی جانے کب سے وہ بے ترتیبی سے وقت کا تعین کرتے ہوئے شک کے دائرے میں آگئے۔

لیکن گھر میں ایک مدت تک ایسی ہوا چلی کہ شاذیہ کے تیور بدلنے کا اُسے احساس تک نہیں ہوا۔ اس کے رویہ میں تھوڑا تھوڑا سا کھنچاؤ آنے لگا۔ بسا اوقات اسکی باتوں سے لہسن کی سی بو آتی محسوس ہوتی۔

شاید وہ بھی اپنے مرد کی کمائی کو ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھ کر اندر ہی اندر پگھل رہی تھی۔

عورت ذات جو ٹھہری۔ شاذیہ کے رویے میں اتنی زبردست تبدیلی کا آنا نہ صرف یہ کہ چونکا دینے

والی بات تھی ۔ بلکہ اُمید سے کوسوں دور تھی ۔

بات بات میں الجھنا......اور اول فول بکنا۔اب اسکی فطرت میں شامل ہو چکا تھا۔ ہر وقت اُس پر ایک جنونی کیفیت سی سوار رہتی تھی ۔

''شرافت بھی کوئی چیز ہے۔''

لیکن شاذیہ شرافت کے لبادھے کو کب کی چھوڑ چکی تھی۔ حتیٰ کہ اکثر موقعوں پر اسکی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔

طعنوں اور دھمکیوں سے شروع ہو کر گالی گلوچ پر ختم ہوتی ۔اب وہ کسی کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تھی ۔شاذیہ کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے تمام حربے استعمال کئے گئے ۔لیکن وہ اپنے راستے سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی ۔

مار پیٹ تک بھی نوبت آ گئی ۔لیکن اس سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آخر مجبور ہو کر سونے کے پلنگ الگ الگ کمروں میں منتقل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی نا کامی ہوئی ......

شاذیہ کٹی پتنگ کی طرح حد پرواز سے بھی آگے نکل گئی۔ دُور بہت دُور...... یہاں تک کہ ایک روز اچانک وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ساری افہام و تفہیم کی کوششیں رائیگان ہو گئی تھیں۔ اب ایک طرح سے تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔

شاذیہ کے ساتھ گزارے ہوئے شریں لمحات کی ساری یادیں راکھ کے ڈھیر میں دفن ہو چکی تھیں۔اس کا وجود اب اکائی پر آ کر سمٹ چکا تھا۔

اس کی ملازمت کی معیار ختم ہونے کو تھی۔ پنشن کے کاغذات کی پڑتال ہو رہی تھی ۔ چند ماہ کے بعد ایک معقول رقم ملنے کی توقع تھی۔اب زندگی میں ایک ہی مقصد کار فرما تھا اور......وہ تھا فریضہ حج ادا کرنے کی ایک دیرینہ حسرت ایک مدعا......

اچانک اُسے برسوں سے اکیلے پن کے احساس سے بوریت محسوس ہوئی۔اس کے دل میں دبی راکھ کے ڈھیر میں کہیں سے ایک ہلکی سی چنگاری سلگ پڑی ۔وہ تنہائی کی شدت سے کانپ اٹھا۔ شاید کسی کی محرومی کے احساس نے اس کے سارے وجود کی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اپنی ذہنی الجھن اور اضطرابی کیفیت سے بچنے کے لئے یہی تنہائی کا حل نظر آیا کہ وہ اب بازار سے ہر روز شاذیہ اور اسکے بچہ سے ملتی جلتی تصویریں خرید کر گھر لائے ۔اب یہ اس کا روز کا معمول بن چکا تھا کہ ان خریدی ہوئی تصاویر کو دیوار پر ٹانگ دے ۔ اس طرح اُسے تھوڑا سکون محسوس ہوتا تھا۔

حج کمیٹی میں تمام کاغذات کا اندراج مکمل ہوا اور ڈرافٹ جمع کر لیا گیا۔ اب ٹیکے لگانے کی تاریخ کا مقرر ہونا باقی تھا۔ جس کا اُسے کافی بے چینی سے انتظار تھا۔

ہسپتال کے آوٹ ڈور روم کے باہر بہت بھیڑ تھی۔ سب لوگ انتظار میں بیٹھے تھے۔ ہر شخص اپنی باری پر اپنا نام پکارے جانے کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کمرے کے اندر چلے جاتے...... کام نمٹا کر ہشاش بشاش لوٹ آتے۔

سارا کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔

اُسے سارے جسم میں عجیب سی اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اندر سے کوئی بلاوا نہ آنے پر اسکے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ اب اُسے مزید انتظار برداشت نہیں ہوا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی میز پر ایک ڈاکٹر کسی فائل کو دیکھنے میں محو تھا۔ دوسرے ملازم کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل رہے تھے۔

قدموں کی آہٹ پاتے ہی ڈاکٹر پر اشتیاق نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''کیا آپ ہی مسٹر آصف ہیں۔''

''جی ہاں۔'' اسی بدنصیب کو یہ دنیا والے آصف کہتے ہیں۔'' اسکی بھاری آواز میں شکایت کی رمق عیاں تھی۔

''آپ کو یہاں تک آنے میں کافی انتظار کرنا پڑا۔ اس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں...... دراصل آپ کا ایڈرس پڑھنے کے بعد میں کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔'' وہ چند لمحوں تک سوچ کر بولا۔

''کیا آپ کو میرے ایڈریس میں کوئی کمی نظر آئی۔'' آصف نے اُسے بدستور سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ سمجھنے والی بات تو ٹھوس حقیقت سے کسی طرح بھی کم نہیں......''

ڈاکٹر کا لہجہ کچھ عجیب سے انداز کا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر استعجاب کے نشانات صاف اُبھر رہے تھے۔ اس نے بیگ سے سرنج نکال کر شیشی میں سے تھوڑی سی سیال بھر دی۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔''

''شاید ... کبھی اتفاق ہوا ہے آپ کا......''

سوئی اس کے بائیں بازو میں پیوست ہو چکی تھی۔

''آں......ہاں......''

سوئی کی چھن محسوس کرتے ہوئے اسکے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل پڑی۔

چند لمحوں تک اس کی چیخ سارے کمرے میں گونجتی رہی۔

کافی دیر تک ان کی آنکھیں ایک دوسرے کا سامنا نہ کرسکیں۔

دیکھتے ہی آنکھوں میں سے آنسوؤں کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ اور خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔

اور دیر تک آصف خیالات کے سیلاب کی رُو میں بہتا چلا گیا۔ پھر اچانک جب اسکی ناؤ گھاٹ سے جا لگی محسوس کیا تو اسے بازار کی خریدی تصویروں کے گول مٹول صورتیں۔ اسی کی باتیں اسکی شکل وصورت میں اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آیا۔ یک لخت اسکے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی اور سارے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ڈاکٹر کی حالت بھی اس سے کچھ کم نہ تھی۔ اسکے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل سی رہی تھیں۔ ایک عرصہ سے اسکی ماں شاذیہ اپنے شوہر کی جدائی جھیلنا برداشت نہیں کر پا رہی تھی اُسے اپنی غلطیوں کی پاداش میں دوبارہ اسکے ساتھ زندگی گزارنا چاہنے کے احساس ہو گیا تھا۔

دیر تک وہ اس بات کو چھپانے سے ہچکچاتا رہا یا اُسے کہنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسکے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے آصف کچھ سننے کو کافی متفکّر اور بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے اس بات کا قلق رہا کہ آواز اسکے ہونٹوں اور حلق کے درمیان جیسے اٹک کر رہ گئی ہو۔ آصف انتظار کرتا رہا۔

ہرچند اس طرح کھویا ہوا تکون دو زاویوں سے تیسرا زاویہ ملانے سے کربناک جدائی ایک بار پھر ملن میں بدل جاتی۔

تب حج کو جانے سے بہتر یہ نئی ازدواجی زندگی آصف کو بھلی لگتی جو حج کے ثواب سے کسی طرح کم نہ تھی......!!!

......☆☆☆......

''نقاب''

وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی برقعہ کے بٹن ٹانک رہی تھی۔ جو سورج کی تمازت اور برسات کی وجہ سے ساری رونق کھو کر ایک بے مقصد چیز بن کر رہ گیا تھا۔ پرانے کپڑوں کے ڈھیر میں کسی چیز کی تلاش کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لگا تھا۔ جو اس نے کبھی تہہ کر کے سلیقے سے الماری میں رکھ دیا تھا جیسے کسی نوزائد بچے کو پالنے میں سلاتے ہیں۔۔

...... تھکن کے احساس سے اس کے چہرے پر مایوسی کی چھاپ گہری ہوتی جارہی تھی۔ وہ سر میں قدرے بھاری پن محسوس کرنے لگی۔ پیشانی پر نرم گداز انگلیوں کے لمس میں اضافہ ہوتا گیا اور پرانی باتیں پلٹ کر اس کے اندر بے یقینی کی سی کیفیت پیدا کرنے لگیں۔

چند لمحے ایسے گزرے جیسے اسکی ساری زندگی پانی پر تیرتے ہوئے تنکے کی طرح گزر گئی ہو۔ بے اختیاری میں اس نے سامنے دیوار پر لگے آئینے پر نظر ڈالی تو اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ سیاہ بالوں میں ایک لمبا سفید بال کسی اژدھے کی طرح کنڈلی مارتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ جو پلک جھپکتے ہی اسکی انگلیوں کی گرفت میں آ گیا۔ اس نے چٹکی میں پکڑ کر جھٹک دیا۔ اور اطمینان سے ایک گہری سانس چھوڑ دی۔

''میرے انگنا میں تمہارا کیا کام ہے''...... ریحانہ ترنم آواز میں مصرعہ کو گنگناتی ہوئی برآمدے میں آ گئی اسے مشتبہ نظروں سے گھورنے لگی جیسے اسکی بے باکی نے اس کے سارے بدن میں آگ لگا دی ہو۔

''ممی۔!''

''ہوں۔''

''آخر کب تک یوں ہی ٹانکے لگاتی رہو گی۔ میری سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔ اب اسکی کیا

ضرورت پڑی ہے جبکہ یہ کب کا آوٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے"......ریحانہ اپنی بانہیں اسکی گردن میں حائل کر کے کچی ٹہنی کی طرح لٹک گئی۔اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"میں اپنی سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ڈیڈی نے بھی کہا۔"

"آج سے تم اب اس طرح کمرے سے باہر نہیں جا سکتی ہو۔" ممی فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"ممی! تمہیں آج کیا ہو گیا ہے مجھے اس سے ملنا ضروری ہے۔" ریحانہ ایک طرف ہٹ گئی اور کچھ دیر سحر زدہ کھڑی رہیں۔

"کہہ جو دیا" اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

"لیکن میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"بالکل نہیں۔ایک بار جو کہہ دیا۔"

وہ اُسے سپاٹ نظروں سے دیکھتی جا رہی تھی۔سامنے کسی گُڑیا کی طرح، منی اسکرٹ اور بلاوز میں کس قدر حسین اور جاذب لگ رہی تھی۔سفید سفید پنڈلیاں اور بازو شفاف دودھیا جیسا سفید۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ائیر پورٹ کی رن وے جس پر دو سپر جٹ جہاز مد مقابل کھڑے ہوں۔اور شانوں پر گھنیری زلفیں بادلوں کی طرع پھیلی ہوئی تھیں کہ ہوشمند بھی اپنے ہوش کھو کر جہازوں پر سواری کرنے کے متمنی نظر آئیں۔

"ڈیر ممی! پلیز مجھے جانے دو۔"

"ریحانہ۔میرے مغز نہ چاٹو اور میرے لیے تمہارے یہ ناز نخرے اور بے حیائی قطعی برداشت سے باہر ہے۔"

وہ آپے سے باہر ہوگئی۔

"مما" وہ قدرے چیخ پڑی۔کچھ دیر چپ چاپ خالی الذہن دیکھتی رہی۔پھر فرش پر پیر پٹختی کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جانے کب تک وہ یوں ہی بیٹھی رہی اور اپنے آپ کو کوستی رہی۔ گھر میں جوان لڑکی۔اتنی بے

باک اور ضدی...... وہ محسوس کرنے لگی جیسے ایکدم ہزاروں بجلیاں اس پر گر پڑیں۔ایک لمحہ کے لیے اُسے ایسا لگا تھا جیسے دنیا کے سارے غموں اور تفرقوں میں قید کر لی گئی ہو۔ ہزاروں خواہش اور مرادوں کے پھل اور اب یہ بے حیائی؟

وہ اس تصور سے کانپ اٹھی۔ وہ مریم جیسی پاکیزگی اور فاطمہ جیسی پاکدامنی اور حجاب کے خواب دیکھ رہی تھی۔مگر سارے خواب ایک ایک کر کے چور چور ہو رہے تھے۔

نا اُمیدی اور مایوسی کے سیاہ ہالے میں وہ بری طرح پھنس کر رہ گئی۔مگر وہ ان باتوں کی خود ذمہ وار تھی۔اس نے بہتے دریا کی رفتار دیکھی تھی جس کی حد قائم رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

''یہ سب کیوں اور کیسے ہوا''۔وہ اپنے آپ سے اصرار کرتی رہی مگر مفلوج سوچ جواب نہ دے سکی۔

''کیا ہم خود اس بے حیائی کے ذمہ دار ہیں۔لڑکیاں جو چاہتی ہیں کر بیٹھتی ہیں، نہ کسی کی روک نہ ٹوک۔

وہ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔ ہماری زندگی اس قدر کیوں کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری سوچیں، ارادے اور خیالات پلٹا کھا گئے ہیں اور زندگی کا اصلی مقصد فوت ہو چکا ہے۔اُسے رہ رہ کر اپنی جوانی کے وہ حسین لمحے ذہن کے تاریک گوشوں میں کلبلاتے نظر آنے لگے۔جب اس نے سوچ سمجھ کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ کس ماحول میں پروان چڑھی تھی۔

بزرگوں کے سامنے بات کرنے میں ہچکچاتی تھی۔ ماں باپ کی آواز سنتے ہی پسینہ سے شرابور ہوتی۔کبھی تو تن سے روح نکل جانے کی نوبت آجاتی۔ پردے کا رواج تھا۔ساڑھی یا ڈوپٹہ سر سے سرک جانے پر گھر میں ایک طوفان سا برپا ہوتا۔بالوں کے نت نئے اسٹائل کی خوشبودار تیل کی بو گھر میں کس جگہ سے نہیں آتی۔ تفریح گاہوں کی نہ صرف ممانعت تھی جبکہ ان جگہوں کے ناموں سے بھی بے خبر تھیں۔صرف لے دے کے کبھی کبھار کسی آستانہ شریف یا شادی بیاہ پر کسی کے ہاں آنا جانا ہوتا تھا۔

زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ نہ وہ حجاب رہا نہ شرم وحیا۔آستانوں کے بجائے اب لڑکیاں سنیما تھیٹروں کی پرواننی بیٹھی ہیں۔اس سے بڑھ کر اپنے بوائے فرینڈ کے سوا نہ چین ہی آتا ہے اور نہ مزا۔

برقعہ یا پردہ ایک فرسودہ چیز بن کر رہ گئی۔ بالوں کا اسٹائل بدلتا رہتا ہے۔خوشبودار تیل سے کام نہ بن پڑا۔لپ اسٹک اور کریم پاوڈر سے زیبائش ہونے لگی۔کل تک جو پردے میں کپڑے کی گھٹڑی لگ رہی تھی اس کے جسم کا ہرزاویہ دکھائی دینے لگا ہے اب۔

نجانے اس سے آگے کیا کیا سوچتی رہی۔بیٹھی بیٹھی اسکی آنکھ لگ گئی۔

نئی تمہید کے ساتھ صبح نمودار ہوئی۔دوسرے دن کے آغاز پر پرندوں کی بولیاں سنائی دینے لگی۔وہ

اٹھی۔ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کی تیاری میں لگ گئی جبکہ ریحانہ کپڑوں پر استری کرنے میں مشغول تھی۔

ہاکرنے باہر دروازہ کو پہلے کھٹکا دیا۔برآمدے میں اخبار چھوڑ کر یہ کہہ کر چلا گیا۔

شہر میں ٹریفک جام ہوا ہے۔کسی سیکس اسکنڈل کا انکشاف بھی ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی ریحانہ بھاگی بھاگی اخبار لینے آئی۔اخبار کی موٹی موٹی سرخیوں کا جائزہ لینے لگی ۔اخبار کی شہ سرخی پر نظر پڑی۔باٹم حصہ میں ایک جلی سرخی میں لکھا تھا۔

شہر کے اندرونی علاقہ میں پولیس نے ایک قحبہ خانہ پر چھاپہ مارا۔موقعہ پر پانچ کمسن لڑکیوں کو دبوچ لیا گیا ہے" موں کی نقاب اوڑھے چہروں کا الگ الگ فوٹو اور نام و پتہ درج ہے

پوری تفصیل وہ پڑھ نہ سکی۔سامنے اُسے ہر سُو تاریکی ہی تاریکی دکھائی دی۔اچانک سر چکرانے لگا۔

گرتے گرتے بالآخر اس نے تشکر آمیز نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا ورنہ ایک اور تصویر کا اضافہ ہونا یقینی تھا آج......!!!

..................☆☆☆..................

پہلا افسانوی مجموعہ
"بند مٹھی سے بھاگا پرندہ"
پڑھنا نہ بھولیئے۔

اپنی بات

چندہ جمع ہو گیا تھا......!

میز پر ابھی بھی دو بند لفافے پڑے ہوئے تھے۔

کئی زیر غور تجویزیں انجینڈے میں شامل کر لی گئیں تھیں۔

علاقے کے کئی معزز اور معتبر بزرگ جمع تھے۔ حاجی عبدالصمد۔ ماسٹر انور علی۔ لیاقت حسین، منور زمان ایڈووکیٹ وغیرہ۔...... مجلس جانے پہچانے ہر دلعزیز بزرگ رحیم درویش کی سرپرستی اور قیادت میں منعقد ہو رہی تھی۔

میز پر پڑے دونوں لفافے کھول دیے گئے......!

ایک لفافے میں ان ناموں کی ترتیب وار فہرست تھی جو کافی عرق ریزی اور سوچ وچار سے تیار کر لی گئی تھی۔ فہرست میں مستحق اور ضرورت مندوں کے نام ترتیب وار درج تھے۔

دوسرے لفافے میں ان لوگوں کے نام اور پتہ درج تھے۔ جنہیں امداد دینا مقصود تھا۔ لیکن قرضہ حسنہ کی ان پر لیبل چسپاں تھی۔ مدعا صرف اتنا تھا کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ تاکہ اس رقم کو وہ اپنے اپنے دھندوں میں لگا کر اپنی مشکلات کا ازالہ کر سکیں۔

پہلی فہرست میں سے گنے چنے نام و پتے منتخب ممبروں کو دیے گئے اور طے شدہ رقم بھی سپرد کر دی گئی......

دوسری فہرست میں بھی محتاج افراد کی نشاندہی کی گئی اور انہیں مالی اعانت دینے کے لئے رحیم درویش کو نامزد کیا گیا۔ ساتھ ہی وقتاً فوقتاً ان کی کارکردگی پر نظر ثانی کرنے کی استدعا کے ساتھ مجلس برخاست ہوئی......

چندہ بانٹ دیا گیا......!

تمام کاروائی اخبارات میں مشتہر کی گئی۔ اس کے علاوہ کاروائی مقامی مسجد شریف کے سائن چسپان کردی گئی۔ البتہ ناموں کا اعلان صیغہ راز میں رکھا گیا۔

دن ہفتے میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے......!

یونہی ایک دن شام کو جب رات گیلی ہوتی جارہی تھی۔ رحیم درویش ٹہلتے ٹہلتے اُس کے برآمدے تک آ گیا۔ چند لمحوں تک سوچ کر اُس کے ذہن میں ایک خیال سرعت سے گزر گیا۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں دیکھوں کہ کھیتی کیسے جا لگی۔؟ دراصل ان مستحق لوگوں میں ندیم بٹ بھی شامل تھا جسکی ٹیلرنگ کی دکان بستی میں تھی۔ مفلوک الحال اور پسماندہ ہونے کے سبب اس نے اچھی خاص رقم طور مالی معاونت حاصل کی تھی۔

رحیم درویش آگے بڑھا......!

اس کمرے تک عمودی سیڑھی کا تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جہاں سے عجیب سی قسم کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔

اُس کے بھاری بھرکم قدم زینوں کی مسافت روندتے ہوئے اُس کمرے تک جا پہنچے جسے دیکھتے ہی وہ ششدر رہ گیا۔ نفرت اور غصہ سے اس کا پارہ اتنا چڑھ گیا کہ کنپٹی کی رگیں پھڑ پھڑانے لگیں۔

سامنے بیٹھا ندیم اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے میں اس قدر مشغول تھا کہ اُنہیں اس بات کی بھنک تک نہ پڑی۔ کہ کب سے رحیم درویش دروازے پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسکے بار عب چہرے پر غصے اور شرارت کے ملے جلے اثرات صاف جھلک رہے تھے آنکھوں سے دہکتے ہوئے شعلے اگلنے کا گمان بھی ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دماغ کی کوئی نس پھٹنے والی ہے۔

اسے اس بات کی قطعی اُمید نہ تھی کہ تصورات کی دنیا میں سوچ سمجھے قلعے دھڑم سے زمین بوس ہو جائیں گے۔ اس کی کوششوں اور فراخ دلی کے دریا میں غیر متوقع طغیانی سب کچھ بہا کر لے جائے گی۔

جوں ہی اُنہوں نے رحیم درویش کو قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا دروازے پر دیکھا۔ تو وہ سکتے

میں آگئے۔ان کے چہروں پر ایسی مردنی چھا گئی جیسے ابھی ابھی قبروں سے دو لاشیں باہر نکال دی گئیں ہوں یا رحیم درویش کے سامنے برہنہ کسی بُرے کام کے ارتکاب میں پکڑے گئے ہوں۔ان کی زبان گنگ رہ گئی۔

سارے کمرے میں قہقہے تھم گئے۔ اب صرف ٹی،وی (T.V.) سے نکلتی ہوئی شعاعیں آسیب زدہ پر چھائیوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔

رنگین کرنیں رحیم درویش کے چہرے کے اتار و چڑھاؤ کو صاف بیان کر رہی تھی۔

"کیوں صاحب زادے! بس اسی چیز کی کمی رہ گئی تھی۔سوچا تھا کہ قرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ نئے سرے سے کسی "اچھے" کام میں رقم کو صرف کروگے لیکن بڑی عجلت سے تم اپنی ذات پر اتر آئے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کے اندر داخل ہوا اور صندوق پر رکھے ٹی،وی کو ایک کپڑے میں باندھ کر بڑبڑاتے ہوئے بگولے کی طرح نکل گیا......

"کیا اسی لیے امداد ملی تھی؟"

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔خالی صندوق دیکھ کر بچوں کے چہروں پر اداسی کے کرب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا......اور بھیگی بلیوں کی طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ جانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

سارے کمرے میں کچھ ایسا سکوت چھا گیا جیسے کسی ویران قبرستان میں لوگ کسی مردے کو دفنا کر واپس لوٹ چکے ہوں......!!!

..................☆☆☆..................

'اور شکار چھوٹ گیا'

یہ دنیا حوادث سے بھری پڑی ہے
دوران زندگی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر حادثوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کوئی جان لیوا تو کوئی اذیت ناک ہوتا ہے۔ برسوں سے یہ سلسلہ چلتا آیا ہے۔

غیر معمولی نوعیت کے حادثے ذہن کے کینواس پر اپنے نشانات دیر تک چھوڑ دیتے ہیں کہ بھلا دینے پر بھی بھولے نہیں جاتے۔

منی بس اُس علاقہ کے اسٹاپ پر رکی جو شہر کی گنجان آبادی سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ جگہ شہر کے پراگندہ اور کثافت آلودہ ماحول سے بالکل الگ کافی خوب صورت پُرسکون جھیل ڈل کے سرہانے پر واقع تھی۔اشبر نشاط کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہمیشہ سے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔

اس علاقے میں کئی ہوٹل، سرکاری اداروں اور نجی کوٹھیوں کی ایک خاصی تعداد تھی۔ یہاں ایک ٹرسٹ بھی قائم تھا۔ناخیز افراد اس تربیتی ادارے سے فن موسیقی میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

اُس علاقے میں پہلی بار اس کا تبادلہ ہو گیا تھا۔نئ صبح کو ٹرسٹ کے پہلے دن کا آغاز ہو رہا تھا۔

وہ منی بس سے باہر نکل آیا تو سارا بس اسٹاپ خالی پڑا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بھیڑ دیکھی اکثر لوگ چلتے چلتے اسے شجر ممنوعہ سمجھ کر آگے جاتے ہیں۔

فٹ پاتھ پر کوئی تیس سالہ نوجوان اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ لحیم وشحیم تندرست نوجوان کے ماتھے پر خون کی ایک پتلی سی لکیر موجود تھی۔ سرہانے کے قریب کالا چشمہ دو حصوں میں ٹوٹا پڑا تھا۔ دھیمی دھیمی آواز میں کراہتا۔اپنے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو داب کر اوپر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ پاس ہی ایک معمر شخص شانہ تھپتھپاتے ہوئے اسکی ہمت بڑھا رہا تھا۔ایک معمر خاتون اپنے کپڑوں پر مٹی دھول

جھاڑنے میں مشغول تھی۔

پاس ہی چند لوگوں کے دائرے میں ایک اعلیٰ نسل کا ایشین کتا سڑک پر بے سدھ پڑا تھا۔ ابھی تک اس کے جسم پر تازہ خون کے دھبے موجود تھے۔ گھنے بالوں سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ پچھلی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی۔ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ خوف سے منہ پر ایسا تالا لگا تھا۔ ورنہ پین پین کرتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیا ہوتا۔

اس کی خراب حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دل تو پسیج جاتا۔ کسی کو چھونے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ہاتھ گندے ہونے کے ڈر سے سبھی ہچکچاتے تھے۔

بھیڑ میں کانا پھوسی ہو رہی کہ ایک تیز رفتار اسکوٹر سوار کی زد میں کتا آ گیا تھا۔ جو معمر خاتون سے سنبھالا نہیں جاتا تھا۔ بال بال بچ گیا تھا۔ معمر خاتون اس کا کتا اور نوجوان کو گھائل چھوڑ کر اسکوٹر سوار رفو چکر ہو گیا تھا۔

اچانک ایک لڑکی پریشان گھبرائی ہوئی بھیڑ میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور دل دھڑک رہا تھا۔

ہاتھ میں ڈنڈا لئے دو سپاہی اسکے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے۔

''کیا ہوا......؟ خوف میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ایکسیڈنٹ!'' مونچھوں والا سپاہی غرایا۔

''مما۔ چوٹ نہیں آئی'' درد بھری آواز سنائی دی۔

لڑکی نیچے جھکی۔ ماں کی ٹانگ دابنے لگی۔ ماں کی یہ حالت اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''شکر ہے بیٹی۔ تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔

تب اُس نے کتے کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اسکی کمر سہلانے لگی۔ لوگوں نے جیسے راحت کی سانس لی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''پیو۔ پیو۔ آنکھیں کھولو۔''

نرم ریشے والی جسم پر نازک انگلیوں کے لمس اور آواز جانی پہچانی لگی۔

پیو نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں نے نظریں ملا دیں۔ کتے نے دھیمی دھیمی آواز نکال کر بھونکنا شروع کیا۔ خوف زائل ہو چکا تھا۔

لوگوں کی متجسس نظریں بدستور گھور رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے ان کی نگاہیں پپو کی جگہ لڑکی پر جم گئیں۔ قیامت کی پڑیا لگ رہی تھی وہ...... پل بھر کے لیے ان کے دلوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ اٹھارہ بیس سال عمر کی تھی۔ چھریرا بدن۔ سینے پر ساٹھ وولٹ دونوں بلب دوسو وولٹ جسامت کے لحاظ سے کسی عورت کا سا گمان ہوتا تھا۔

مہندی رنگ کے ترشے بال، گندمی رنگ چہرہ سرخ مائل شگوفہ جیسے دونوں رخسار تھے۔ خوشنما سوزنی کام کیے ہاف بلوز مردانہ سائز قمیض، جین کی پتلون میں لڑکی کم اور لڑکا زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔

کتا سینے سے دیر تک پین پین کرتا رہا۔ بھیڑ چیرتا ہوا ایک ماڈرن عمر نوجوان آگے بڑھا۔ محبت بھرے انداز میں لڑکی سے کتا لینے لگا۔

''چوٹ زیادہ نہیں آئی؟''

کچھ کہے بغیر لڑکی ایک دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ تشویش بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ اتنے میں مٹھی بھر داڑھی والے دوسرے نوجوان نے اپنے کندھے پر پڑے کپڑے کو اتار دیا۔ بڑی سرعت سے کتے کی پچھلی ٹانگ کو اپنی طرف کھینچ کر اُسے لپٹا دیا۔ خلوص بھرا لہجہ تھا۔ لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی سی خراش آئی ہے۔''

ماڈرن نوجوان کو اسکی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ من ہی من اُسے کوستا رہا۔ اپنی برتری کا لوہا منوانا چاہتا تھا...... اُس نے لڑکی کو اپنی جال میں پھانسنے کا ارادہ کیا تھا۔

''کسی نزدیکی اسپتال لے چلیں۔ ماں جی کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔''

''ہاں۔ ہاں، یہ ٹھیک رہے گا''۔ کئی لوگوں نے اثبات میں سر ہلائے۔

نوجوان کے دل میں خوشی کے پٹاخے پھوٹ پڑے۔ اسکی بنی بنائی ترکیب کامیاب ہوئی تھی۔ جونہی وہ چند قدم آگے بڑھی تو زخمی جوان کو دیکھ کر سارے بدن میں آگ لگ گئی۔

''کم بخت کو پولیس کے حوالے کردہ''۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح دہاڑی۔

''بہتر میڈیم۔ وہاں سالے کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔'' اچانک مونچھوں والے سپاہی کو اپنا فرض منصبی کا خیال آیا جو ابھی تک خود ایک تماشائی بنا رہا تھا۔

''ہٹو۔ہٹو۔ایکسڈنٹ کا معاملہ ہے۔جاؤ اپنا کام کاج کرو۔ورنہ ٹریفک جام ہوگا۔''

مونچھوں والے سپاہی نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔ہاتھ میں ڈنڈا اٹھایا۔دیکھتے ہی سب لوگ منتشر ہونے لگے۔

''خدا نے دو آنکھیں دیکھنے کو دیں۔اندھا بنا رہا۔''ایک آدمی طیش میں آکر کہنے لگا۔

اس کی بات پر سب لوگ ہنس پڑے۔

شاید معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے اور ہاتھ میں آیا ہوا پرندہ پُھر ہو جائے گا۔یہ سوچ کر داڑھی والے سپاہی نے اپنی داڑھی کو انگلیوں سے کھجلانا چھوڑ دیا۔بائیں ہاتھ میں اس کا ڈنڈا جھٹ ہوا میں لہرایا۔نوجوان کی پشت اور بائیں بازو پر زور سے برسا۔

''مارو سالے کو......''وہ چیخی۔جیسے اسکے اندر سوکھی گھاس نے دوبارہ آگ پکڑ لی ہو۔

اسکی بات میں کیا اثر تھا۔شہد کے چھتے میں پتھر لگا۔آؤ دیکھا نہ تاؤ۔گالیوں، لاتوں اور گھونسوں کی برسات شروع ہوئی۔دھلائی ایسی ہوئی سینے کی ہڈیوں اور معدے کی آنتوں کو خبر لگ گئی۔

وہ ہر وار سہتا رہا۔کوئی مزاحمت نہ کی۔درد کی شدت ہلکی سی کراہ میں تحلیل ہو جاتی۔

''اس کا خیال رکھنا۔''

داڑھی والے سپاہی کے اندر کا آدمی جاگ گیا۔معاملہ گھمبیر پایا۔لڑکی کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔

''یا اللہ۔تو بڑا کارساز ہے۔اس پر اپنا فضل کر۔''

ابھی معمر شخص اپنے دعا سے فارغ ہی ہوا تھا کہ مونچھوں والے دوسرے سپاہی نے نوجوان کی شرٹ کا کالر زور سے پکڑا۔

''چل سالے۔میم صاحب کی کتیا کو مروا دیا۔بوڑھی عورت کی ٹانگ بھی توڑ دی۔''

''بھئی!اس کا قصور نہیں۔کتا اسکے پیچھے پڑا تھا اور ایکسڈنٹ تو سکوٹر سوار نے کیا ہے۔

معمر شخص یہ سوچ کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کر کے اپنی بات منوا لیتا۔لیکن اپنی تائید میں وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔بھلا حوالات اور کورٹ کچہری کے چکر میں کون پڑنا چاہتا ہے۔

وہ خاموش، مایوس اور نڈھال سپاہی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔چند قدم آگے بڑھ کر سپاہی نے

کالر چھوڑتے ہی بھاری بوریا سمجھ کر اُسے آٹو رکشا میں دھکیل دیا۔ اتنے میں معمر شخص کا بھی کوئی اتا پتا دکھائی نہ دیا۔

کسی فلم کا ادھورا اسپنس سین سمجھ کر ٹرسٹ کے بجائے مقامی تھانے پر اس نے جانے کا ارادہ کیا۔ چونکہ نوجوان یہاں اجنبی تھا کسی سے مدد کا طالب نہیں ہوسکتا تھا اور بے قصور پکڑا گیا تھا...... اس کا موبائل بھی گم ہو چکا تھا۔ چنانچہ تھانے پہنچ کر اس نے انسپکٹر سے درخواست کی کہ چاہے آپ مجھے حوالات میں بند کر دیں اور جو چاہیں سلوک کر لیں مگر مجھے ایک فون کرنے کی اجازت تو دیں۔

انسپکٹر نے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے فون کرنے کی اجازت دیدے مگر موٹی اسامی سمجھ کر اجازت دے دی ۔ یہ سوچ کر نوجوان نے انسپکٹر کی میز پر پڑے فون سے نمبر ڈائل کیے۔ پھر وہ کسی سے بات کرنے لگا تھا۔

''میں اسوقت پولیس کی حراست میں ہوں۔ بے قصور دھر لیا گیا ہوں۔''

نوجوان نے اتنا کہا تھا کہ ادھر سے گرجدار آواز آئی۔

''انسپکٹر کو فون دو۔''

نوجوان نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ انسپکٹر کو فون دیا۔

انسپکٹر نے ریسور کان سے لگایا تھا۔ دور سے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔

''میں ہوم منسٹر کا پی اے بول رہا ہوں یہ منسٹر صاحب کا آدمی ہے۔۔ خیریت اسی میں ہے کہ اسے فوراً چھوڑ دو۔ ورنہ تمہاری دوری..................

کانپتے ہاتھوں سے انسپکٹر نے ریسور رکھ دیا۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ بھیگی بلی بنکر اس نے سپاہی کو حکم دیا...... ''اسے چھوڑ دو۔'' ......!!!

وہ زیر لب بڑبڑایا ''ہاتھ لگا شکار چھوٹ گیا''

..................☆☆☆..................

بدلتے چہرے

اسکول کے نوٹس بورڈ پر ڈیٹ شیٹ Date Sheet چسپاں کیا گیا۔

چند روز بعد سالانہ امتحان شروع ہونے والا تھا۔ امتحان کی تیاری کرنے کے لیے بچوں کو اسکول سے تعطیل کر دی گئی۔ چھٹی پا کر بچے خوش وخرم اور جھومتے جھامتے اپنے گھروں کی جانب لوٹنے لگے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اپنی مگن میں آگ برساتے ہوئے سورج میں تپتی تارکول سڑک پر جا رہا تھا۔ امتحان کی تیاری میں شش و پنج کے حصار میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اچھے نمبرات سے پاس ہونے کا خواہاں تھا۔ راستے میں خوابوں کی ایک نئی دنیا بسا رہا تھا۔

شاید وہ گھر سے بھوکا نکلا تھا۔ اسکول سے نکل کر سیدھے گیٹ کے سامنے ایک ریڑے والے کے پاس آ گیا۔ مٹھی بھر چنے کی پڑیا خرید کر اپنی جیب میں رکھدی تھی۔ چلتے چلتے کبھی کبھی چند دانے منہ میں ڈال کر چباتا ہوا اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔

چند کوس دُور چل کر اپنے مکان کی چھت دکھائی دیتی نظر آئی۔ دفعتاً اُسے ماں کی بات یاد آئی۔ اسکول جاتے وقت اُس نے یقین دلایا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر حلوہ اور بریانی کھلائے گی۔ بریانی اور حلوہ یاد آتے ہی اسکی خوشبو اسکی نتھنوں میں چلی آتی محسوس ہوئی۔ بے خیالی میں وہ اپنے ہونٹوں کو چاٹتا رہا۔ خوشی سے سرشار اٹھا۔ اسکے بدن میں پھرتی سی آ گئی اور چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔

وہ تیز تیز لمبے لمبے ڈگ بھرتا رہا۔ اپنے ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جائے۔

صحن میں اپنا پہلا قدم رکھا کہ دُور سے اس نے اچانک باپ کو غصہ کی حالت میں سامنے کمرے سے نکلتے دیکھا تو دیکھتے ہی جیسے اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور منہ میں حلوہ و بریانی کے ذائقہ کی بجائے سبزی ہری مرچ کی کڑواہٹ محسوس ہوئی۔ وہ اس سے باپ کی موجودگی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

اچانک اُسے باپ کی شیر جیسی دہاڑتی آواز سنائی دی۔

’’کیوں حرام خور! کیا کوئی راج پاٹھ تاراج کر کے آ گیا۔ اب گھر میں چور کی طرح گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔‘‘

’’نہیں پاپا تعطیلات کے تحت۔ آج سے اسکول میں چھٹی دی گئی دو دن بعد امتحان ....‘‘

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جیسے بولنے کی ہمت جواب دے گئی ہو۔ جب اس نے باپ کے چہرے پر تاثرات رنگ بدلتے دیکھے۔

تو گھبرا کر دو تین قدم آگے بڑھا۔ گردن جھکی جھکی نظریں نیچی کیے اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا۔ لیکن بھاگنا مشکل ہو گیا۔ باپ کی کرخت آواز اسکی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ چونک سا گیا۔ پھر وہاں وہ کھڑا تھا وہیں بت کی طرح ساکت ہو گیا۔ زبان حلق اور ہونٹوں کے درمیان جیسے اٹک کر رہ گئی۔

’’تُو جھوٹ کب سے بولنے لگا ہے؟‘‘ یہ سن کر اسکے غصے کا پارہ چڑھا۔

’’میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ڈیٹ شیٹ کی ایک کاپی میں نے سنبھال کر رکھی ہے۔‘‘

’’ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔ کبھی میچ اور کبھی دوڑ کے مقابلہ کی باتیں کرتا ہے تو......‘‘ یہ کہہ کر اسکے باپ کا چہرہ لال ہو گیا اور بھوئیں سکڑ گئیں اور اب وہ اسکی طرف خونخوار نظروں سے دیکھے جا رہا تھا......

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آج کیونکر خلاف توقع باپ کا لہجہ ذرا اونچا اور تلخ تھا۔ اگر حقیقت سے دیکھا جائے اُسے جھوٹ بولنے کی عادت بالکل نہیں تھی۔ اور نہ گھر میں کبھی کسی کو وقت سے پہلے اسکول آنے کی اسکی شکایت رہی تھی۔

’’کیا پرسوں تین بجے نہیں آیا۔‘‘ اس کا باپ مزید بگڑ کر بولا۔

’’اس دن سکول میں کرکٹ میچ تھا۔‘‘

’’یہ اسکول ہے یا کباڑ خانہ...... ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے بچوں کا مستقبل خراب کر رہے ہیں۔‘‘

’’ماسٹر جی کہہ رہے ہیں۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود بھی ضروری ہے۔‘‘ بے ساختہ اسکے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی جو باپ کو ناگوار گزری۔

’’ان کی طرفداری کرتے اب تم زبان درازی بھی کرنے لگے ہو۔

طیش میں آکر باپ نے ایک ہاتھ سے اسکا باز و رزور سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اسکے گال پر بے تحاشہ کئی طمانچے رسید کئے کہ اسکی آنکھوں میں تارے بھر دیئے اور اُسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔

زیادہ دیر کرخت اور ترش ڈانٹ سن کر اسکی ماں کی نظر اس پر پڑی۔ وہ تاب نہ لاسکی۔ اسی وقت کمرے سے تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے خاوند کے سر پر پہنچ گئی اور بیٹے کو اسکے چنگل سے چُھڑا کر ایک طرف کو لے گئی۔ پھر خاوند کی طرف پلٹ کر شیرنی کی مرح دھاڑنے لگی۔

''کیوں ناحق بچے کو پیٹتے ہو۔ کیا نرمی سے پوچھ نہیں سکتے۔؟''

''تمہارے ہی لاڈ پیار نے اُسے بگاڑا ہے۔''

''میں خود ہی اس سے پوچھ لیتی۔ اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' خاوند کو خاموش کر اکے وہ بیٹے کی طرف مڑ کر بولی۔

''ارے مورکھ۔ صاف صاف پہلے بتادیا ہوتا تو مار کیوں کھاتا۔''

''خدا گواہ ہے۔ میں نے پاپا سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' ...... بیٹے کا جواب سن کر وہ خاموش ہوئی اور خاوند کے چہرے کو ایک ٹک دیکھا۔ اسکے چہرے پر ایسے تاثرات اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کوستی رہی کہ ایک معمولی سی بات پر اُن سے جھگڑا کر بیٹھی اور اب اسکی سزا اسکا بیٹا بگت رہا تھا۔ ورنہ وہ اس بات سے بے خبر نہ تھی کہ۔ پچھلے مہینے ہی وہ بیٹے کے دانت کے درد پیدا ہونے پر ساری رات جاگتا رہا۔ ایک پل بھی نہ سویا تھا......!

وقت کا پہیہ چلتا رہا......!

صبح صبح ساس بہو کے درمیان زور زور سے غصہ دلانے والی باتیں جب سننے کو ملتیں تو بہو کی جھوٹی باتوں کا پہلے سے جواب جانتے ہوئے بھی کہنے کو جی نہ چاہتا تھا اور بیگم شائستہ کی زبان سے بہو کی بدگوئی اور غلو بیانی پر کان دھرے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ خاندانی وقار کا سوال تھا۔ شریف النفس تھا۔ انہیں روک ٹوک بھی نہیں سکتا تھا اور نہ کبھی شرارت میں آکر جذباتی ہو گیا تھا۔ البتہ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے وہ بار بار سلجھاتے سمجھاتے تھک جاتا تھا......

والد کرامت علی کا مزاج کچھ انوکھا اور اسکی طبیعت دوسروں سے کچھ ذرا مختلف اور یگانہ تھی۔

بے بسی کے عالم میں وہ اکثر بجھے دل کے ساتھ کہتا کہ اپنا بھی خدا ہے۔

ایک عرصہ سے انور علی یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے ان کی تو تو اور میں میں کرنا برداشت سے

باہر لگ رہا تھا۔ وہ کسی الجھن میں تھا۔ جہاں عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی کا معاملہ تھا۔ اور بیچ میں وہ اٹک کر رہ جاتا تھا۔ پھر جب وہ طغیانی سر سے اوپر گزر گئی تو اسکے ماتھے پر بل چڑھے اس سے رہا نہ گیا۔ آپے سے باہر ہو کر اُس نے بے جھجک اپنا فیصلہ سنایا۔

"پاپا کو اس عمر میں سکون و آرام کی ضرورت ہے۔ اسکی صحت بھی اچھی نہیں رہتی۔ کوٹھری کا جو خالی کمرہ ہے ان کے لیے مناسب اور موزون جگہ ہے ۔ جہاں انہیں اٹھنے بیٹھنے اور آرام کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ اٹھانی پڑے گی۔ دیر رات گئے تک ٹی وی دیکھنے میں کسی کا دخل بھی نہ رہے گا۔ جو بھی چاہیں اپنی مرضی کے مالک ہونگے۔"

بات دھماکے کی طرح ثابت ہوئی۔ بات آئی گئی اور ہوگئی۔

شاید نسرین کو اس پل کا انتظار تھا۔ برسوں سے وہ یہ بات سننے کو ترستی تھی اور تھک بھی گئی تھی۔ لیکن اب کی بار جو اسکے دل کو ٹھنڈک مل گئی وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔ بس اللہ تو بھلی اچانک اسکے من کی مراد پوری ہوئی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ باپ اور بیٹے میں ٹھن گئی ہے۔

کرامت علی کے یہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس فیصلے نے اسکے خوشحال گھرانے کی اینٹیں ایک ایک کر کے ہلا کر رکھ دی ہے۔ بیٹے کے سامنے اف تک نہ کر سکا۔ اچانک ایک خوشحال گھر کی دیوار سے ایک ایک اینٹ کھسک رہی تھی۔ وہ اس صدمے سے ٹوٹ گیا اور اب بکھرنے کے قریب تھا۔

آخر کرامت علی کو اپنے بیڈ روم جو کشادہ ہال جیسا تھا کی بجائے درمیانہ سائز کے کمرہ میں شفٹ کرنا پڑا۔ برسوں سے یہ کمرہ بے کار پڑا گھر کے فالتو چیزیں رکھنے کے کام آتا تھا۔ گو یہ کمرہ اس کے لئے نیا نہ تھا۔ اسکے بیڈروم کے برابر میں ہی تھا۔ اس کمرہ سے وہ کسی بھی وقت اپنی بیگم شائستہ کو آواز دے کر بلا سکتا اور بچوں کے غل غپاڑے کی آوازوں سے محفوظ بھی رہتا......

کئی دنوں تک انور علی کی نگرانی میں سب سے پہلے کمرہ کی صفائی ہوتی رہی اور پھر جہاں جہاں دیواروں پر پلستر کے ٹکڑے اکھڑ کر گر چکے تھے۔ اسکی مرمت کے ساتھ نئے سرے سے سفیدی کرائی گئی۔ فرش پر باپ دادا کے زمانے کا پرانا کشمیری قالین بچھایا گیا جو کئی برسوں تک گرد و غبار اور دھول و مٹی سے میلا ہو جانے کے بعد بھی اپنی رونق کھو نہ چکا تھا۔ البتہ ایک کونے کو چوہوں نے کترا کر داغدار بنا دیا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی کھڑکی لگی تھی جسکا پٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اسے ایک ڈیزائن دار سوتی پردہ سے سجایا گیا تھا۔

کھڑکی کے پاس ایک چھوٹی سی میز تھی۔اس پر ٹی وی اس رخ سے رکھا گیا تھا کہ کرسی سے پشت لگا کر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھا جاسکتا تھا اور بائیں جانب تھوڑی سے دوری پر پانی گلاس طشتری سے ڈھکا رہتا تھا۔ایک بیڈ بھی لگوایا گیا تھا۔جس پر صاف ستھری رضائی بچھائی گئی تھی۔غرض ہر چیز اچھی اور اپنی جگہ پر تھی۔کسی قسم کی جھنجھاہٹ کو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''اب کمرہ کیسا لگ رہا ہے۔کسی چیز کی کمی تو نہیں ؟'' انور علی نے کمرے کا جائزہ لیتے اپنی ماں سے پوچھا جو اخبار ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں آگئی تھی اور کرامت علی کے پاس کھڑی آکر اسکے چہرے کو تک رہی تھی۔

''میں کیا جانوں۔یہ بات خود اپنے پاپا سے کیوں نہیں پوچھ لیتے ہو؟ بیگم شائستہ سیخ پا ہو کر بولی۔

انور علی نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے ماں بیٹے میں تکرار ہونے کا خدشہ رہتا۔

''آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

''بیٹے۔جو کچھ ہوا، اچھا ہی ہوا ہے۔اس عمر میں بوڑھا کسی منڈیر پر بیٹھا تو بھی اچھا ہی لگنے لگتا ہے۔'' کرامت علی بادیدہ نم کہنے لگا۔

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''

''میرا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔اس عمر میں اکثر لوگ شور وغل سے بھاگ کر تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔لیکن میں کہاں تنہا ہوں۔میرے پاس سب کچھ ہے۔جوان بیٹا۔فرمان بردار سلیقہ مند بہو ہے۔چھوٹے چھوٹے خوبصورت پوتا پوتی ہے اور تو اور تمہاری ماں شائستہ بیگم بھی ہے۔اپنا بھی خدا ہے۔وہ کیا کم ہے۔'' کرامت علی نے بجھے دل کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ بے فکر رہیں پاپا۔کوئی بھی خدمت ہو تو فوراً آواز دیجئے گا۔سب لوگ حاضر ہو جائیں گے۔آپ اپنے آپکو اکیلا اور تنہا نہ سمجھیں، روز روز کی لڑائی، جھگڑوں سے نجات پانے کا بس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' انور علی یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے سے شفٹ کر لینا انور علی کا مقصد تھا۔اسکے خلاف گھر میں کسی نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ اٹھایا اور نہ ہی اسے معیوب سمجھا جانے لگا۔دراصل یہ سرد جنگ ساس بہو کے درمیان چل رہی تھی اسی کا پھل تھا۔

ایک عرصہ سے نسرین ساس اور سسر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ محض اس بات پر کہ اسکے سسر کرامت علی کو اکثر رات کھانسی آتی تھی اور اسکی کھانسی کی وجہ سے انکے بچوں کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ اِسکی دوسری شکایت یہ رہی کہ گھر میں وہ سارے دن بیٹھے بیٹھے دن میں سوتے رہتے۔ پھر دیر رات تک ٹی وی دیکھتے ہیں۔ بچوں کو ہوم ورک کرنے کی بجائے ان کا سارا دھیان ٹی وی کی طرف چلے جانے سے کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ نتیجتاً اسکول سے ان کی غفلت شعاری برتنے کی شکایت آتی رہتی۔

بات آئی گئی اور شائستہ بیگم اپنے شوہر کی طرف پورے طور پر دفاع کر نہ سکی۔ کرامت علی نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ ایک لفظ بھی اپنے منہ سے بول نہ سکا تھا جس گھر کو بنانے میں اس نے اپنی عمر بھر کی محنت اور سرمایہ لگایا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بے دخل ہونا پڑا تھا۔ آخر مجبوراً ہو کر ایک تنگ چار دیواری میں آ کر وہ ایک تماشائی بن کر کھڑا سب کچھ برداشت کرتا ہوا بس دیکھتا رہ گیا۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا۔ اُس روز ناغہ تھا۔ بچے باہر لان میں کھیلنے میں مشغول تھے۔ کرامت علی اپنے کمرے میں بیٹھے ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اچانک موبائل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز کسی چیز کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ چند لمحوں میں بات پوری ہوئی اور موبائل خاموش ہو گیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا الماری کی طرف بڑھا۔ الماری میں پڑی کتابوں اور فائیلوں کو مکینکی انداز میں الٹ پلٹ کر نجانے کیا تلاشتا رہا۔ بڑی مشکل سے اسکے ہاتھ ایک چھوٹے سائز کا پرانا البم آ گیا۔ جسے دیکھتے ہی اسکے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ واپس مڑ کر اپنی جگہ کرسی میں دھنس گیا۔ معاً کمرے میں اس کا پوتا انیسؔ داخل ہوا۔ البم دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا اور زور زور سے تالیاں بجاتا بڑبڑاتا رہا۔

”دادا جی، دادا جی۔ آپ یہ پرانا البم لے کر کیا کر رہے ہیں اور بڑے شوق سے ان تصویروں کو گھور گھور کر دیکھتے جا رہے ہیں؟“

”آ گیا شیطان کہیں کا۔ اب کام کرنے بھی نہ دے گا۔“ کرامت علی نے چہرے پر خفگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔“ انیسؔ چپ رہنے والوں میں سے کہاں تھا۔ دیکھنے کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ پاس آ کر آگے کو جھکا اور اسکے ہاتھ سے البم چھین لینے کی کوشش کی مگر کرامت علی نے دور رہنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے تنگ نہ کر بیٹے۔ میں اپنی کوئی فالتو تصویر کی کاپی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”لیکن کیوں؟......“

''موبائل کمپنی کا فون آیا تھا۔انہیں میری دو تصویروں اور آئی کارڈ کی ضرورت ہے اور انھوں نے موبائل بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔'' ......کرامت علی نے بات کی پوری وضاحت کی۔

''اوہو۔اب سمجھا۔پاپا بھی کل الماری میں دو فوٹو کا پیاں تلاش کر رہے تھے۔''

عین اسی موقع پر اچانک انیسؔ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ٹی وی سکرین پر کسی پرانی فلم کا کاسٹ دکھایا جار ہاتھا۔انگریزی حروف میں تھا۔ جسے انیس اونچی آواز میں مختلف کرداروں کا نام لیتا رہا۔

پھر جب فلم کے سنگیت نے کرامت علی کے کام میں رخنہ ڈالا۔اس وقت اسکے ہاتھ کوئی پرانی تصویر آئی۔جسے وہ بار بار دیکھتا رہا۔ایک نامعلوم اداسی نے اسکی آنکھوں میں اپنی دنیا بسائی کہ ایک ایک پرانی یاد تازہ کردی۔ ذہن کے قرطاس پر پھیلتے ہی دل و دماغ اور روح میں اتھل پتھل مچ جانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ چہرے پر کبھی مایوسی اور کبھی خوشی کے ملے جلے اثرات بدلتے رہے۔سارے بدن میں نامعلوم محرومی سے بے کیف لذت اور بوجھل پن محسوس کرتے ہی ایک ہلکی سی ٹھیس سی لگی۔ وہ سوچتا رہا اور ماضی کو آئینہ کئے بیٹھا رہا جیسے ایک ایک خواب اسکی نگاہوں کے سامنے پھر گیا ہو۔

''فلم ''وقت'' اس نے اسوقت دیکھی تھی۔ جب وہ دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔عید کے موقع پر ماموں جان نے اُسے بطور عیدی کچھ روپے دیئے تھے۔پہلی بار اسکول سے فارم حاصل کرنے کے بہانے گھر سے نکلا تھا۔اپنے ایک ہم جماعت کو ساتھ لے کر فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔گو کہ یہ اسکے اسکول کا زمانہ تھا اور پہلی بار چوری چھپے فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔اُسے یاد آیا اس نے کئی بار اسکول گراونڈ ہال میں کئی پرانی فلمیں جیسے دو بیگھ زمین، آندھی اور طوفان اور علی بابا چالیس چور دیکھی تھی۔ سنیما گھر کے باہر قطار میں کھڑے ہو کر ٹکٹ لینے کی کوشش کرنا زندگی میں اسکا پہلا تجربہ تھا......

ان دنوں وہ کتنا شرمیلا اور ڈرپوک تھا۔وہ اپنا منہ مفلر سے چھپائے رکھا تھا۔سردی کے باوجود سارا بدن پسینہ سے تر ہو جاتا اور ٹانگیں خوف و ڈر سے کانپنے لگتیں۔آنکھوں سے وحشت ٹپکتی۔ایسا محسوس ہوتا تھا۔جیسے کسی بھی وقت اس پر رعشہ کا حملہ ہو سکتا ہے۔جوں توں کر کے فلم اختتام ہونے سے قبل ہی وہ ہال سے باہر نکل آتا اسکے ساتھی سنیما گھر کا کونا کونا چھان مارتے۔تھک کر وہ گھر لوٹ آتا۔کئی دنوں تک کلاس کے اندر اور باہر لڑکوں کو فلم کی کہانی سنایا کرتا اور داد و تحسین حاصل کرتا۔دو تین بار کہانی سناتے اُستادوں سے پٹ بھی جاتا......آہ......ایک آزاد پنچھی جیسی زندگی بسر ہوتی تھی۔جس ٹہنی پر من کرنے کو کرتا پھدک کر بیٹھ جاتا...... پھر ایک لمبا عرصہ گزرا......

دوسری بار جب اس نے یہی فلم ''وقت'' دیکھی تھی اس وقت عنفوان شباب زوروں پر تھا شادی

کا پورا ایک مہینہ نہ ہوا تھا۔ اپنی نئی نویلی دلہن شائستہ بیگم کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ بیوی کی فرمائش کو کیسے ٹال سکتا تھا۔ اُسکی اپنی سہیلی نے فلم کی کافی تعریف کی تھی۔ جسکی حال ہی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے میاں کے ہمراہ دیکھنے گئی تھی۔

کرامت علی کو وہ دن یاد آنے لگا۔ کتنے رس بھرے اور میٹھے میٹھے لمحات ہوتے تھے۔ شہد میں بھگوئے ہوئے جیسے مزیدار دن اور راتیں...... گھومنا پھرنا۔ گپیں اڑانا اور موج و مستی کرنا سارا جہاں ست رنگ قوس قزح کی طرح نظر آتا تھا۔ اور پھر جب رات کو بستر پر ایک دوسرے کا گرم گرم سانسوں کا لمس شریر میں سرائیت کر جاتا تو فرشتے پھولوں کی بارش برساتے زندگی کا سارا سکھ نصیب ہوتا اور ہزاروں رنگینیاں آنکھوں میں رقص کرنے لگتیں۔

اور آج......!

کرامت علی کو فلم وقت چلتے چلتے نہ کوئی خوف و ڈراب ہراساں کر رہا تھا۔ اور نہ ہی اب کسی کے بدن کی گرمی کے لیے جذبات بے قابو ہو رہے تھے۔ نہ کسی کے کتابی چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرنے کے لیے اسکا بے تاب دل مچل رہا تھا۔ اُسے لگا کہ جیسے وہ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح زندگی کی جنگ ہار کر اپنے تمام ہتھیار ڈال چکا ہو یا اپنی ناکامیوں کے احساس میں پچھتاوے کی آگ سے بھسم ہو کر راکھ میں تبدیل ہو گیا ہو۔

وہ سوچنے لگا فلم وہی "وقت" ہے۔ جسے وہ اپنے تین الگ الگ مقامات پر دیکھ چکا ہے۔ وہی پرنٹ ہے۔ وہی کردار ہیں اور وہی گھسی پٹی کہانی...... بار بار دھراتے ہوئے گھسیٹتی جا رہی ہے اور اپنے وجود کا بھرم قائم کئے ہوئی ہے۔ کچھ نہ بدلا تھا۔ ہر بار اسی شان و شوکت سے دکھائی جا رہی ہے۔

سکرین پر سین بدلتے رہے۔ کرامت علی کے ذہن کے قرطاس پر ایک ایک کر کے واقعات یاد آتے رہے اور گزرتے گئے۔ پھر اچانک اسکے ذہن کی ان بکھرے لکیروں میں جونہی ایک نئی روح سرائیت کر گئی۔ تو اسکے سامنے ایک خاموش طوفان بنکر جو دھیرے دھیرے اسکے وجود پر حاوی ہو کر چند لمحوں تک وہ لرزتا رہا اور کانپتا رہا۔ بھاگ بھی نہ سکا۔ نہ اس کو روک سکا۔ نہ ہی اپنے آپ کو بچا لیا۔ آخر سوچوں کی یلغار میں دور تک بہتا چلا گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے تیز رفتاری سے بہتا ہوا پانی پتھروں سے ٹکرا کر گنگنانے لگتا ہے۔ اگرچہ اس گنگناہٹ میں بلا کی تاثیر تھی۔...... لیکن ایسی بے قراری تھی۔ ایسی بے بسی تھی ایسی بے چینی تھی جو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

اتنا پتھر دل نہ تھا کہ ان واقعات کو ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ بھول جاتا۔ اُسکے سینے کے اندر

ایک دبا دبا سا درد اٹھنے کا احساس ہونے لگا۔ اس پر رقت سی طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی نمی اتر آئی اور ذہن میں اتھل پتھل مچ گئی۔ ساتھ ساتھ سانسیں بھی رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ پھر جب سوچوں کے اندر بغاوت کی ایک لہر سی جاگ اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے من ہی من میں سوچا کہ ایک عرصے سے وہ جو خواب دیکھا کرتا اور اس سے اپنے دل میں پرورش کرر ہا تھا۔ اسکی تعبیر پانی پر منجمند برف تودے کی صورت میں تیرتی دکھائی دینے لگی۔ زندگی کی ٹیڑھی میڑھی ہموار ناہموار اور سخت سنگلاخ راہوں پر چلتے چلتے وہ اس قدر تھک چکا کہ وہ اب چناروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بھی خوف و دہشت اور بے لذت نظاروں کا عادی ہو گیا ہے۔ پھر جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے آس پاس، سارا ماحول، سارا گھر اور سارے گھر کے مکینوں کے ہوتے ہوئے بھی بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

نجانے کب تک کرامت علی ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اُسے شائستہ بیگم کے اندر آنے کی خبر نہ رہی۔ وہ چند ساعتوں تک اُسے گھورتی رہی اور یہ دیکھ کر اسکی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

کرامت علی ہاتھ میں تصویر لئے مگر آنکھیں اسکی سکرین کی جانب ٹکٹکی باندھے لگی تھیں۔ شائستہ بیگم نے اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مڑ کر واپس جانے لگی۔

کرامت علی فلم میں کونسا سین دیکھ رہا تھا کہ اسکی آہٹ سنکر چونکتے ہی اسکے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے شائستہ بیگم کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اسکے ہاتھ میں ایک ایسی تصویر تھما دی جسے دیکھ کر وہ دنگ سی ہو کر رہ گئی۔

وہ دیر تک اسکے چہرے کو دیکھتا رہا پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا۔

"یہ جو تصویر تم دیکھ رہی ہو، کس کی ہو سکتی ہے؟"

یہ سن کر شائستہ بیگم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

"ایسا لگتا ہے کہ یہ تصویر ان دنوں کی ہے۔ جب میں جوان تھی۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم جوانی میں کافی خوبصورت، ہنس مکھ اور چنچل ہوا کرتی تھی۔ نجانے کتنے نوجوانوں کو زیر کرتی رہی ہو۔ میں تمہاری کئی عاشقانہ ملاقاتوں کا تب تذکرہ سن چکا ہوں لیکن اس نوجوان کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے بعد تم نے میرے البم میں لگانے کی جرأت کیسے کی۔ صاف صاف بتا۔ اسکے ساتھ کوئی پرانا معاشقہ تو نہیں چل رہا ہے۔ تمہارا" کرامت علی نے اسکے کان کے پاس دھیرے سے کہا۔

یہ سنتے ہی وہ برف کی سل بن کر رہ گئی۔ اسکے چہرے پر زعفرانی رنگت چھا گئی۔ پسینہ کی چند بوندیں ماتھے پر لرزنے لگیں۔ جبکہ وہ اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ معاملہ خواہ مخواہ اس قدر گھمبیر صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن اُسے احساس تھا کہ واقعی اس نے ستانے کی غرض سے غلط بات کہہ دی تھی۔

"ذرا یاد کر۔ کہیں یہ تمہارا کلاس فلیو تو نہیں رہا ہے۔" اس نے دوسرا سراپھیرا سوال کیا۔

تھوڑی دیر تک وہ یاد کرتی رہی۔ جیسے اپنی یاداشت کی مٹھی میں چلتی آندھی کو بند کر لینا چاہتی ہو۔ یتیم زدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ بڑی مشکل سے اپنی گھٹتی ہوئی سانسوں کے درمیان پھسی پھسی آواز میں بولی۔

"مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ آخر یہ جوان کون ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے میری ہو بہو شکل میں کوئی دوسری لڑکی اپنے مرد کے ساتھ ہو۔" شائستہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں۔ آنسوؤں سے لبریز۔ پلکیں جھپکاتی وہ انگلیوں سے پُتلیاں رگڑنے لگی تھیں۔

کرامت علی حیران رہ گیا۔ اُسے اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ انسان کے خیالات اور جذبات کتنے بدلتے رہتے ہیں۔ اُسے اپنے ہی مرد کی شکل پہچاننے کے لیے اسکے بدلتے چہرے کو یاد رکھنے میں کبھی کبھی کس قدر کوفت اور خفت اٹھانا پڑتی ہے......!!!



چنار کے پھول

''اس بار کہیں وہ دوبارہ دوسری غلطی نہ کر بیٹھے اُسے کچھ کرنا چاہیے۔''

کچھ لوگ یہ سوچتے سوچتے کافی دیر سے اداس۔ پریشان اور تذبذب کے شکار ہو گئے تھے۔ سارا ماحول خوف زدہ سا گھمبیر لگ رہا تھا اور ہر کس و ناکس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے ایک نامعلوم ڈر و خوف اور تفکّر کے اثرات کی پرچھائیوں کے گھیرے میں آ گئے ہوں۔ دیکھتے دیکھتے ایک خوشحال گھر کو کس کی بد دعا یا نظر لگ گئی تھی ...... اور وہ اس صدمے سے باہر نکل نہیں پا رہی تھی......!

ان سب سے الگ کافی سنجیدہ و پریشان تھی اور سہمی سہمی تھی۔ اسکے اندر نہ جانے کیا توڑ پھوڑ ہوتی رہی کہ سہلیوں کے مجمع میں خود کو تنہا اور اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے آس پاس عزیز و اقارب سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ ہر چند اس نے اپنے اردگرد خاموشی کا ایک ایسا آہنی حصار بنا رکھا تھا کہ اس حصار سے نہ خود باہر آئی اور نہ ہی کسی کو اندر داخل ہونے دیا۔ اب اگر کوئی اسکے قریب جانے کی ہمّت کرتا تو اتنی سختی سے جھٹک دیتی۔ تو انہیں شرمندگی اور ندامت سے کھسیانی حالت ہو کر رہ جاتی۔ لہٰذا اب نہ کسی کو بات کرنے کی ہمّت ہوئی اور نہ کسی بات کا جواب دینا مناسب سمجھتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ سوچ رہی تھی اور سوچتی رہی۔

ذرا سی چونک جاتی تو دوسری غلطی ہونے کا خدشہ لگا رہتا۔ پھر بڑی قیمت چکا دینے کا سوال تھا۔

''بیک وقت دو دو غلطیوں کی تلافی ناممکن لگتی ہے۔'' اس نے خیال کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی خاتون حضرت حوا علیہا السلام نے باغ جنّت میں دھوکے سے شجر ممنوعہ کا پھل چکھا جو گندم سی شکل و صورت رکھتا تھا۔ بحکم خداوندی دونوں کی اس نافرمانی کی پاداش میں انہیں بہشت سے بیدخل ہونا پڑا۔ نجانے کیا کیا گل کھلتے۔ وہ تو خدا جانے۔ اسکی پناہ......!

کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلی غلطی پر اس کا خمیازہ اٹھا چکی۔ نتیجہ جو سامنے تھا۔

کسی کا اعتبار کیا۔ اعتبار کے دھوکے میں اڑتی اڑتی اوپر سے جو گری چکنا چور ہونے میں دیر نہ

لگی۔سب کچھ اتنی جلدی اتنا اچانک ہوگیا کہ جو اسکے وہم وگمان میں نہ تھا۔

سانپ کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔لیکن اس کے ڈسنے سے مری نہ جیتی رہی بس تڑپتی رہی۔

باپ کو بھی درد وکرب کے سیلاب میں اپنے ساتھ ڈبو دیا۔

یہ رات تمام گھر والوں پر قیامت کی رات تھی کہ اچانک ہنستا کھلتا ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔مکان کا چپہ چپہ جیسے مایوس ساپڑا تھا جیسے اُلو اور جھینگروں نے اُسے اپنا مسکن بنالیا ہو۔

کمرے میں پلنگ پر دراز سرخ جوڑا اوڑھے اس نے رو روکر اپنا بُرا حال بنالیا تھا۔جو نجانے کتنے برسوں پہلے ماں نے اس کے لئے بنوا کرر کھا تھا۔زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہی۔اُسے بنی سنوارتی دیکھتی۔اپنے ساتھ یہ حسرت لے کر گئی اور ان سموں کو افسردہ اور نڈھال کر دیا۔

ایسا کیا حادثہ ہوگیا کہ اسکے معصوم دل کر گہری چوٹ پہنچائی۔اس کا سارا وجود متزلزل ہوا۔مایوسی سے وہ کانپ سی اٹھتی پچھتاوے کی آگ میں بُری طرح جلنے لگتیں۔باہر آ کر کسی سے ملنا چاہتی تھی نہ کچھ بانٹنا چاہتی تھی۔

باہر دروازے پر کچھ لوگ شش و پنج کی کیفیت میں اسکے جواب کے منتظر کھڑے تھے۔جبکہ اُسے ہمت نہیں ہوتی۔اپنے ابو سے آنکھ ملانے کی۔بے گناہی جانتے ہوتے بھی شرم وحیا کا خیال تھا۔

اس کا اتنا قصور تھا۔کہ جذبات میں اندھی ہوگئی تھی......پھر بھی پڑھی لکھی سمجھدار تھی۔سوچ کر قدم اٹھایا۔کوئی پاپ نہیں کیا۔

منہ سے نکلی بات ہو یا کمان سے نکلا تیر کبھی واپس آیا ہے؟ جبکہ اُسے اچھے اچھے گھرانوں سے کئی رشتے آئے تھے۔رشتہ داروں نے بھی بہت پیغام بھیجے۔علی انور بھی ڈائری سے انجان نام و پتے چھانٹ چھانٹ کر کئی جگہوں سے معلومات اکھٹا کرتا رہتا۔پھر جب تھکا بوجھل قدموں کے ساتھ لوٹ آجاتا تھا۔

تب تھکن کا احساس ہوتے ہی بستر پر لیٹے لیٹے رات کے نصف پہر تک چھت کو گھورنے لگتا۔تکان غالب ہوتی۔صبح ہونے تک کوئی خبر نہیں رہتی۔آنکھ کھل جاتی تب اُسے دوسری طرف کہیں جانے کی فکر لگ جاتی۔

ہمیشہ ہر رشتہ کو ٹھکراتی رہی۔کوئی نہ کوئی کھوٹ نکال دیتی یا ہنسی مذاق میں ٹال دیتی اس طرح اپنی ضد پوری ہوتے ہوئے پھولے نہیں سماتی۔

انور علی ہر دن نادم رہتا۔ سوچتا رہتا تھا کہ لڑکی جوان و بالغ ہو چکی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف چلی جارہی ہے۔ جبکہ وہ کسی کو اپنا دل دے چکی تھی۔!

یہ اس کی پہلی غلطی شمار ہوئی......!

وہ مخلصانہ دوستانہ انداز میں باتیں کرتے رہتے۔ ایسے گھل مل جاتے۔ بات بات پر ہنسی مذاق کی آڑ میں دل میں چھپے اور پوشیدہ باتیں کہنے میں شک و شبہ کا پتہ دور دور تک نہیں چلتا تھا۔ اُسے زندگی میں ہر داؤ سے کھیلنے کا آسان گر سمجھایا گیا تھا۔

اُسے سب کچھ بے کیف لگتا۔ شاید ماں اسکی زندگی میں اُسے زیادہ خوشی دیتی۔ سوچتے سوچتے اسکی خشک آنکھیں نمناک ہو جاتیں......

''پاپا۔ کس سوچ میں پڑے ہیں آپ'' چونک پڑتے تو اپنے سامنے ادھوری کہانی پا کر سینے میں درد کی ٹیس اٹھتی۔ غموں کا ایک پہاڑ جیسے ٹوٹ پڑتا۔ ایسا ہوتا ہے۔ جب کوئی کام ادھورا رہ جائے تو دل میں ایک پھانس سی چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''بیٹی! اب تو حد ہو گئی ہے۔ پاؤں کے جوتے کی ایڑیاں گھسی جارہی ہیں۔ خالدہ پھوپھی کے بیٹے ارشد کے متعلق کیا خیال ہے''پوپھی نے کئی بار مجھ سے پوچھا ہے......

''مجھے بالکل وہ پسند نہیں ہے''

''ایسی کونسی برائی ہے۔ شرافت ہے۔ لیاقت و ذہانت میں ممتاز ہے۔ اچھی خاصی معقول تنخواہ بھی ہے۔''

''کفایت شعار ہے۔ مہینہ بھر شیو نہیں بناتا ہے'' جب بچ جانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ یونہی کوئی سر پھیری بات کہدی۔

یہ بات انور علی کو ناگوار گزری تو تلملا گئے۔

''داڑھی رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اسلامی آداب کو ملحوظ رکھا۔ یہ بات بھول گئی ہو۔ جہیز کے بالکل خلاف بھی ہے''

انور علی اپنی بیٹی کو یقین دلاتا رہا۔ کہ اس کا کردار صالح ہے۔ مگر نا کام رہا۔

''ایسے آدمی کو مولوی ہونا چاہئے۔ کوئی پولیس انسپکٹر نہیں۔''

اُسے اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ نئی پود قدرت کے قواعد و قانون سے بھاگی جارہی ہے۔ ان کی سوچ میں کتنی پسپائی آرہی ہے۔ جیسے طغیانی راستہ میں ہر آنے والی شئے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

اُسے بیٹی کا بدلتا ہوا تیور نظر آیا تو فوراُ دبا دبا قہقہہ لگایا......

دونوں ہنس دیئے اور دیر تک ہنستے رہے۔

اگلے دن شکیل بھی اپنی ہنسی کو روک نہ سکا۔ بے دھڑک ہنسی کا فوارہ منہ سے ایسے پھوٹا کہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے لوگ پہلے متجسس نظروں سے گھورنے لگے پھر خود وہ اپنے آپ ہنس دیئے۔اور باہر گل لالہ باغیچہ تک آئے۔

''کیا سوچ لیا اب۔؟'' نسرین نے اُسے تلملا کر دیکھا۔

''اعتبار نہیں رہا۔؟''

''کب تک اعتبار کرتی رہوں۔ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔لگتا ہے تمہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہا۔''

نسرین نے اُسے جھنجھلا کر جھنجھوڑنا چاہا۔اگلے جملے نے اُسے ڈگمگا کر رکھ دیا۔

''ابھی ایک سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔ممکن ہے۔اسوقت تک لسٹ آجائے گی۔پھر پانچ چھ مہینے ٹریننگ کے بعد...... کچھ توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگا۔'' ٹریننگ کے لئے روپیوں کا انتظام کرنا باقی رہ گیا ہے۔''

''شادی کے بعد بھی کر سکتے ہو۔''

''میں اپنے کیریر کو شادی پر ترجیح دینا پسند نہیں کرتا۔''

''یہ بات پہلے کیوں نہ کہدی۔'' اچانک اسکی سوچ میں زلزلہ سا آ گیا۔

''بُرا مان گئی......؟''

''نہیں اور کیا...... پھولوں کا ہار پہنایا......'' نسرین نے اُسے ناگواری سے دیکھا۔اس نے خوش گوار لہجہ میں حسب عادت قہقہہ لگائے ہوئے اس کی ڈھارس بندھائی۔ بڑی مشکل سے اُسے منالیا۔

''اب ایسی بات نہ ہوگی۔ایک دو مہینے کے بعد میں تمہیں سرپرائز Surprise دوں گا''

''کس خوشی میں......؟''

''بتاؤں گا۔لیکن ایک دو ہفتہ کے بعد''

''یقین جانو۔اسوقت جواب بھی میرا دلچسپ ہوگا''

مذاق مذاق میں دونوں نے ایسے زوردار قہقہے لگائے جیسے کسی چاندی کے خالی کوٹھے میں

سونے کے سکے اچھالے گئے ہوں۔

شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ کارڈ بٹ چکے تھے۔ سجاوٹ کا کام بھی مکمل ہو چکا تھا۔

ایک دلفریب منظر تھا......

خیمہ کے اندر بستی اور قریب کی رشتہ دار عورتوں کے درمیان فلمی گیتوں کا مقابلہ کافی دیر تک ہوتا رہا۔ کہیں عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر گا رہی تھیں۔ کہیں دلہے میاں کی آمد پر روایتی گیت گونجتے رہے۔ تانبے کی دیگچیوں میں گوشت کے لذیذ لذیذ پکوانوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

اب دلہا میاں اور بارات کے انتظار میں دستر خوان بچھانے کی دیر تھی۔ آنکھیں منتظر تھیں۔ چار سو جشن کا ماحول تھا۔

گھڑی کی سوئیاں گھنٹہ گھنٹہ پر نئی شکلیں بدل رہی تھیں اور عورتوں میں ہیجان سی کی کیفیت بڑھ رہی تھیں۔ اب وہ تھکی تھکی بوجھل آنکھوں کے پلکوں پر نیند اڑانے کی فکر میں سرگوشیاں مصروف تھیں۔؛

جب کافی دیر ہو چکی تو سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی دُور دُور تک دلہا راجے کا اتا پتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بہت سے لوگ اپنے اپنے اطراف کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

انور علی ان غیر متوقع حالات پر کافی فکر مند اور سنجیدہ لگ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی تھی۔ تذبذب کے عالم میں گھبرا کر دیر سے اپنے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ دل خون ہو رہا تھا اور چہرے پر اسکے کرب کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

لمحہ لمحہ ساری اُمیدیں چکنا چور ہوتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹیلی فون پر رابطہ بڑھانے کی تمام کوششیں رائیگان ہوئیں۔ سارا مواصلاتی نظام کب کا منقطع ہو گیا تھا۔

رشتہ کے لوگ بات بات کو کرید کر ان کا خون جلایا کرتے۔ جھوٹی ھمدردی جتاتے رہتے۔

زندگی میں کئی تلخ تجربے کا سامنا کرتے اب وہ نا امیدی اور مایوسی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہا۔ جیسے اُسے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت ایک دم منجمد اور سلب ہو گئی ہو۔

اچانک کسی رشتہ دار نے کچھ ایسا انکشاف کیا کہ بنگلے کے سب لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے اور یہ منحوس خبر سارے بنگلہ پر قہر بن کر ٹوٹ پڑی۔

اس خبر نے بری طرح انور علی کے دل کو گہری چوٹ پہنچائی ......نشتر کی طرح اس کے دل و ذہن اور روح کو زخمی کر دیا۔ کان میں آکر کہیں [illegible] گیا۔ اور سارا جسم [illegible] جیسے اس کے

پاؤں وزنی کلہاڑی کی زد میں آگئے ہوں۔ غصّہ اور نفرت سے جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ کے شعلے لپک آئے۔ بیٹی کا غم دیکھا نہیں جارہا تھا۔

مسہری پر بیٹھی خوابوں کی دنیا لٹتے ہوئے نسرین سکتے کے عالم میں تھی۔ سارے سپنوں کے محل چکنا چور ہو گئے تھے......

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ نفرت کی بھٹی میں سلگتی جارہی تھی۔ پچھتاوے کی آگ میں آنسو بہانا کیسے روک لیتی......؟ اس کا مذاق اور سرپرائز دینے والا، پانچ لاکھ کے عوض کسی کے ہاتھوں بک چکا تھا۔

حالات کافی سنگین اور گمبھیر تھے لیکن پھوپھی خالدہ نے ایسی کونسی چونکا دینی والی بات نسرین کے کان میں ڈالی اور اس کے انکار یا اقرار کی منتظر تھی۔

اُسے کیا کرنا چاہیئے......؟

وہ اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ پہلی بار چھری سے صرف گھائل ہی ہوئی تھی۔ اس کی دوسری غلطی عمر بھر کے لئے گراں اور ناسور ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ دیر تک سوچتی رہتی......

اپنے کمرے سے باہر آکر انور علی سے لپیٹ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ بیٹی کے غم میں پاگل جو بنا تھا...... دونوں کی حالت سے ایسا اندازہ ہو رہا تھا جیسے دو لٹے لٹے مسافروں کا آمنا سامنا ہو رہا تھا۔

انور علی اسکے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرتا رہا۔

نسرین نے دوسری غلطی سے بچنے کی غرض سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

من ہی من ناکامی کے الاؤ میں تڑپنے کی بجائے اس نے ارشد کو اپنا سرتاج بنانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آدھی رات کے بعد رخصتی ہوئی۔

..................☆☆☆..................

فرمائش

فیکٹری کی جانب سے علین کو بہترین کارکردگی دکھانے پر ڈپٹی منیجر بنادیا گیا اور اسکی تنخواہ چار ہزار سے اکاون ہزار ہوگئی۔

گھر آکر اُس نے سب سے پہلے اپنی ماں کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی، فرط مسرت سے ڈھیر ساری دعائیں دیتی رہی۔ پھر اُس نے اس اضافی رقم سے اپنے لئے نئی فراق وشلوار اور سینڈل کی فرمائش کی۔

رات یہی بات جب اُس نے چپکے سے اپنی بیوی کو بتائی۔ وہ سن کر پہلے خوشی سے اُچھل پڑی لیکن ساس کی فرمائش والی بات کی بھنک کانوں میں کیا پڑی تو اُس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ برسوں سے ساس کو نیچا دکھانے کا ارمان دل میں چھپا ہوا تھا۔ اپنی اوقات پر آگئی اور فوراً اُس نے سونے کی انگوٹھی خریدنے کی خواہش ظاہر کردی۔

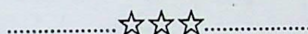
یہ سنتے ہی علین تذبذب کا شکار ہوا۔ دیر تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا، سوچتا رہا۔ گو وہ نرم مزاج رکھتا تھا اور اس سے کہیں زیادہ صلح پسند تھا۔ اپنے ہوتے ہوئے کوئی فتنہ کھڑا ہو کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ کسی کے منہ لگ جانا چاہتا تھا نہ کسی کو دکھی۔ مانو کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سوجھ بوجھ سے کام لیتا تھا اور ہر ایک کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ ماں ورنڈے پر تھی۔ اس نے باہری دروازے سے علین کو خالی ہاتھ آتے دیکھ لیا۔ وہ منہ بنا کر پیر ٹپختے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ علین کی سلام کا بھی کوئی جواب نہ دیا گویا سیدھے منہ بات کرنے کی قسم کھائی ہو۔

اُس کی بیوی دیر تک یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ اُس کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ ایسا ہی چاہتی تھی لیکن دوسروں کے لئے گڈھا کھودتے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی ہے لیکن جب رات کو بستر پر کافی دیر تک کوئی نتیجہ نکلتا ہوا نہ دیکھا تو اُس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے اُس کی خواہش دم توڑنے لگی۔ علین خاموش بت بنا تھا۔ وہ پوچھتے پوچھتے تھک گئی یہاں تک کہ نیند اُس پہ غالب آ گئی۔

دوسرے دن اُس نے ماں اور بیوی کو ناشتے پہ صاف صاف الفاظ میں مختصر بات کہہ دی۔

''میں نے تنخواہ کی اضافی رقم سے مکان بیمہ پالیسی کرا دی ہے میں گھر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔''



توبہ

اس کے پیٹ پر اس نے ایک تیز دھار چھرے سے وار کیا اور اسے تڑپا تڑپا کر ہلاک کردیا۔لاش کو اپنے کندھے پر اٹھا کر ایک سنسان جگہ پر پھینک دیا۔کام سے فارغ ہو کر ایک لمبی سانس لی۔اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی اور وہ اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر فاتحانہ انداز میں بڑبڑایا۔"یہ تو ابھی ایک کم ہی سو ہو گیا"

اب وہ ایک نئے شکار کے متعلق سوچنے لگا۔وہاں سے جاتے ہوئے جونہی اس نے لاش کے پژمردہ چہرے پر حقارت بھری نظر ڈالی تو اچانک اُسے خون میں لت پت دیکھ کر ترس آیا۔تھوڑا سا دل بھی پگھلا۔

دل میں درد کی ٹیس سی اٹھی اور آنکھوں میں پانی بھر آیا۔برسوں بعد اس کے اندر کا سویا ہوا آدمی اچانک جاگ اٹھا تھا۔خود کو ملامت کرتا اپنے کئے پر بڑا پچھتانے لگا ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔حالانکہ قبل اس کے اُسنے بے شمار بے گناہوں کو بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا۔ تب اس کے احساسات میں کبھی تبدیلی آئی۔مگر اب اچانک دل میں توبہ کرنے کا خیال منڈلانے لگا۔ ۔دوسرتے ہی لمحہ وہ تذبذب کا شکار ہو کر نڈھال ہو گیا۔آسمان کی جانب تکنے لگا اور سوچتا رہا کہ اتنے قتل کرنے کے بعد کیا اس کے پچھلے تمام گناہوں کی بخشش ہوگی اور قیامت میں دوزخ کی آگ سے خلاصی ہو پائے گی۔یہ سوال ایک پھانس بن کر اس کے دل میں برابر چبھتا رہا۔

یہ سوچتے ہوئے وہ مولوی صاحب کے پاس گیا مولوی صاحب لالچی اور کسی حد تک پرلے درجے کے خود غرض اور لاپرواہ آدمی تھے۔اکثر مذہبی معاملات میں حدیث وفقہ کی روایت کو نظرانداز کرتے ہوئے عادت سے مجبور جو کچھ منہ میں آیا بغیر سوچ سمجھے کہہ دیتے تھے اور اپنی دھونس جمانے کے لئے عالم وفاضل ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔غرض اس نے مولوی صاحب سے اپنی خواہش ظاہر

کی تووہ بولے'' استغفراللہ...... بخشا جائے گا'' سوچو ہے کھا کر بلّی حج کو چلی جائے''۔ یہ خیال کیسے آیا مورکھ، کہ تجھے بخشا جائے گا۔ یہ سن کر وہ آگ بگولہ ہوگیا اور منہ تکتا رہا۔ اُسے رہا نہ گیا۔ خون میں ابال آگیا۔ دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا چھرا اٹھالیا اور مولوی صاحب کی چھاتی میں پیوست کر کے اسے موت کی گھاٹ اتار دیا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ راستے میں چلتے چلتے ایک فقیر منش صوفی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا اور سارا ماجرا سنایا۔ وہ فقیر منش صوفی دوراندیش شریف النفس اور پرہیزگار تھے۔ انھوں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں' پھر اپنے مخصوص انداز سے گویا ہوئے۔'' اللہ ہو ' اللہ ہو ' وہ بڑا رحیم ہے۔ قادرِ مطلق ہے۔ صدق دلی سے جو توبہ کرے تو بخشش بھی ضرور ہوگی۔ یہ میرا پختہ یقین ہے۔

یہ سنتے ہی نوجوان قاتل خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اور خدا کے حضور میں سربسجود ہوتے ہی مغفرت کی۔ اُمید میں رو رو کر ایسا نڈھال ہوگیا کہ پھر کبھی سجدے سے نہ اُٹھ سکا۔۔ اتنے میں دور کسی مسجد شریف کے مینار سے اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔



پانی کا سایہ

دفتر سے نکل کر جب وہ سڑک کے دوراہے کو پار کرتے ہوئے سامنے تنگ گلی میں گزرنے کے ارادے سے بائیں جانب مُڑا تو پٹڑی کے نزدیک پر ایک آٹو رکشا کو کھڑا پایا۔آٹو رکشا کے گرد لوگوں کی بھیڑ شہد کی۔ مکھیوں کی طرح بھنبھناتی دیکھی اور اسکے اندر ٹیپ رکسی پرانی فلم کا درد بھرا گیت بج رہا تھا...... نجانے کیا سوچ کر وہ آگے بڑھ گیا۔قریب پہنچ کر جونہی اُس کی اچٹتی نظریں آٹو رکشا کے سامنے فرنٹ شیشے پر ٹنگی تصویر سے جا ٹکرائی تو اچانک اُسکے پاؤں تلے زمین کی کھسک گئی ۔سر پر جیسے آسمان ٹوٹ کر گرا اور اُس کا سر چکرانے لگا۔

سارا منظر کتنا اُداس، پشیمان اور مایوس سا لگ رہا تھا۔دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگوں کی آنکھیں نم ناک اور چہرے اُترے اُترے لگ رہے تھے۔

رکشا کے اندر ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں کوئی کڑیل نوجوان مایکروفون پر بار بار ملتجانہ انداز میں طوطے کی رٹ لگائے پاس سے گزرتے راہگیروں سے سوال کر رہا تھا جسے سن کر خود بخود ہاتھ جیب میں چلے جاتے تھے۔پانچ دس یا پچاس روپے کے کرارے یا میلے کچیلے نوٹ دان کی نیت سے اُس کی جھولی میں ڈال دیتے۔اور پھر تصویر پر ایک نظر ڈال کر غمگین چہرہ لئے وہاں سے کھسک جاتے تھے۔

آٹو رکشا کے شیشے پر ٹنگی تصویر ایک خوش پوش خوبرو نوجوان کی تھی ۔تصویر کے نیچے جوجلی اور موٹے موٹے حروف میں تحریر درج تھی پڑھتے ہی جیسے دل پہ چھریاں چل جاتی تھیں۔

''ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اس نوجوان کے دونوں گردے بے کار ہو چکے ہیں۔اب علاج ومعالجہ کے لئے ہنگامی طور پر پانچ لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔صاحب ثروت لوگوں سے اپیل ہے کہ وہ دل کھول کر چندہ دیں اور ایک انسانی قیمتی جان بچانے میں تعاون کریں۔اللہ کے حضور میں ثواب دارین حاصل کریں۔

وہ سکتے میں آیا کیونکہ تصویر کو غور سے دیکھنے پر اسے حاشیے میں اُس فوٹو گرافر کا نام بھی باریک لفظوں میں لکھا نظر آ رہا تھا جس کے پاس اُس نے پچھلے ہفتے خود اپنی تصویر کھنچوائی تھی اور یہ تصویر خود اُسی کی اپنی تصویر تھی۔

☆☆☆

شناخت

قسمت کا یہ کتنا عجیب وغریب کھیل ہے۔ابھی وہ ابتدائی مراحل میں تھا۔ایک عجیب ذہنی پریشانی کا شکار ہوگیا۔بڑی مشکل سے اُسے اس اخبار کے مدیر سے ملنے کا چانس ملا۔

ایڈیٹر موٹے موٹے شیشوں سے اُسے گھور کر اُسکے دئے ہوئے اوراق پڑھنے کے بعد اُس سے مخاطب ہوا۔

''تم کیسے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ یہ مسودہ تمہارا اپنا ہے۔''

''آج تک میں اسی نام سے چھپتا رہا ہوں۔میرے پاس فائل ہے جس میں میری ساری کہانیوں کے مسودے موجود ہیں۔اور انکے کئی اخبارات کے تراشے بھی ہیں۔''

قلم کار کے لہجے میں درد بھی تھا، اعتماد بھی۔

''میرے خیال میں یہ ثبوت ناکافی ہے۔''مدیر نے دوٹوک الفاظ میں اپنی بے نیازی کا مظاہرہ کیا پھر کچھ وقت کے بعد بولے۔''بہتر یہ ہے کہ تم دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا، ورنہ تمہاری افتر پردازی کی خبر شائع کردونگا''

''جناب یہ ادبی بددیانتی ہے سراسر گھٹالا ہے کہ آپ نے میری تحریر کے ساتھ کسی اور کی تصویر چھاپ دی ہے جبکہ قلمی نام ہی نہیں بلکہ میرا ہی لکھا ہے۔''وہ بھی اپنی ضد پہ اڑا رہا......

اچانک وہ آپے سے باہر ہوگیا۔چیخنے چلانے لگا......اور یوں اُسے ایڈیٹر کے کیبن سے باہر نکال دیا گیا۔

جاتے جاتے اُس کے کانوں میں مدیر کی آواز سنائی دی۔۔۔

اس شہر میں سب کچھ گھٹالا ہی گھٹالا ہے ہر ایک آدمی کے کئی رنگ، کئی روپ ہیں۔میرے دوست کا بھانجا ہے۔اسی نام سے چھپتا ہے۔اپنے آپ پر اتنا ہی بھروسہ ہے۔آئندہ سے کسی دوسرے نام سے لکھ دینا۔یہ نام میں نے اپنے دوست کے بھانجے کے لئے منتخب کر چکا ہوں۔جاوا پنی کوئی اور شناخت بنادو......

اُسے لگا وہ نہ صرف اپنا قلمی نام ہی نہیں بلکہ خود اپنی شناخت کھو چکا ہے۔

.................☆☆☆.................

آفر

شہر کے ایک نامی نرسنگ ہوم کے ایک کمرے میں ایک بیڈ پر ایک ضعیف العمر کسی موذی مرض کا شکار ہو کر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ شدت درد سے کراہتے رہنے کے باوجود ابھی تک اپنے ہوش وحواس قائم رکھے ہوئے اپنی سانسیں گن رہا تھا۔

ڈاکٹروں نے اُس کا بچنا محال قرار دیا تھا۔

اتفاق سے وہاں نرسنگ ہوم میں اس کا جواں سال بیٹا بھی کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے وہ اور وہاں کا عملہ اُس کی خبر گیری میں متحرک رہتا۔ اس کی خدمت اور نگہداشت کا خاص خیال رکھا جاتا۔

ایک دن اس کے منجھلے بیٹے نے وہاں مامور ایک نرس کو باتوں باتوں میں اُلجھا دیا۔ چالاک اور شاطر وہ خود بھی تھی لیکن اُس کی اسکے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ اُسنے نرس کو اپنے شیشے میں اُتار کر اپنی کامیابی کی راہ ہموار کر لی اور دل میں چھپے ہوئے ارادے کو ظاہر کر کے اُسے اپنا ہمنوا بنا دیا

''سسٹر میرا ایک معمولی سا کام کرنے پر کیا تم بخشش لینا پسند نہیں کرو گی۔؟''

''مجھے کیا کرنا ہوگا۔ کام کس نوعیت کا ہے یہ مجھے معلوم ہونا چاہئے اوہو......میں سمجھ گئی مگر اس کام کے لئے دس ہزار روپے سے کم ایک پائی نہیں لونگی''

''مسٹر! نرس یہ کچھ زیادہ نہیں......؟''

بوڑھے کے منجھلے بیٹے کا لہجہ کچھ اٹک سا گیا

''زیادہ کی بات نہیں۔بات سودے کی ہے۔پرسوں تمہارے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سے بھی بس یہی ایک غلطی سرزد ہوئی۔''

''میرا چھوٹا بھائی......اُس نے......اُس نے کیا کیا؟'' حیرت اب منجھلے کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔وہ اُسے ہونقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔

''اُس نے میرے ساتھ اس بوڑھے باپ سے ایسے ہی فارم پہ دستخط لینے کا سودا کیا تھا...... میں نے اپنا منہ بند رکھنے کے الگ سے پانچ ہزار مانگے جو اُس نے نہ دیئے نہیں کچھ بتائے بنا وہ کھسک گیا......اسی لیے تو میں نے اپنا منہ بند نہیں..................

اسکے آگے جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔چند لمحوں کے بعد وہ نرس سے فارم لیکر اُس کے ٹکڑے بکھیرتا ہوا ہسپتال سے باہر جا رہا تھا۔

..................☆☆☆..................

ہاف ریٹ

ایک نوآموز لیکھک کو اپنے تازہ ترین افسانوی مجموعہ کی رسم رونمائی کرنے کی فکر دامن گیر تھی ۔ مسلسل ایک ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد اس کی شہر کی ایک ادبی تنظیم کے سربراہ سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ان کے درمیان زیادہ تر گفتگو کتاب کے متعلق تھی اور کئی باتیں زیر بحث آئیں ۔بالآخر شرائط کے مطابق پانچ ہزار روپے پر بات طے ہوئی کہ تنظیم کی جانب سے ادبی مجلس بلائی جائے گی اور اس مجلس کے شہر کی نامور ہستیوں کی موجودگی میں کتاب کی رسم رونمائی پوری ہوگی۔

دوسرے دن شہر کے کئی اخباروں میں ایک خصوصی مشاعرے کا انعقاد کرنے کی خبر آ گئی۔ کچھ دن بعد ایک مقامی سکول میں مجلس منعقد ہوئی تھی ۔لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا رہا۔ جسے دیکھ کر لیکھک کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔سینکڑوں کی تعداد میں شائقین ادب کارش دیکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید کتاب ہاتھوں ہاتھ بک جائے گی اور کتاب چھپوانے کی لاگت اور تنظیم سے طے شدہ رقم کے علاوہ مزید منافع بھی ہوگا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک مشاعرے کا دور چلتا رہا۔اختتام ہونے سے قبل صاحب صدر نے اختتامی تقریر میں خطاب کرتے ہوئے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج اور افادیت پر زور دیا اور پھر نوآموز لیکھک کے ادبی کارناموں پر تعریفی کلمات کی بوچھاڑ کی ۔تالیوں کی گونج میں کتاب کی رسم رونمائی ادا کی گئی جسے دیکھتے ہوئے خوشی کے مارے لیکھک کے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔مجلس ختم ہوئی۔ پھر جب دیکھتے دیکھتے سارا ہال خالی ہو گیا تو۔لیکھک اداسی کے مارے اپنا ماتھا ہتھیلی پر ٹکا کر گم سم ہو گیا۔ اس کا لگایا ہوا اندازہ غلط ثابت ہو چکا تھا۔تھوڑی دیر پہلے میز پر جو کتابیں فروخت کے لیے رکھی گئیں تھیں ۔ان میں زیادہ تر کتابیں وہاں ہی دھری کی دھری رہ گئی تھیں ۔کوئی ان کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا البتہ چند ایک نے موقع دیکھ کر کچھ کتابیں اڑا لی تھیں یوں اس کی جھولی میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں پڑی۔

دوسرے دن لیکھک نے اپنی ساری کتابیں کباڑی کی دکان پر چھوڑ دی تھیں ۔ کباڑی نے دکان کے باہر ایک بورڈ لگا لیا تھا۔اس پر لکھا تھا۔

”یہاں شہر کے ایک افسانہ نگار کا تازہ افسانوی مجموعہ ہاف ریٹ پر دستیاب ہے۔

............☆☆☆............

چند تاثرات

کہا جاتا ہے کہ ''ادب انسانی سماج کا عکاس اور ادیب اس کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔'' یہ مقولہ یوں تو ہر عہد، ہر زبان اور ہر خطّے پر محیط ہے۔ مگر زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' پر یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے۔ کیوں کہ مجموعے کے خالق ''شیخ بشیر احمد'' نے اپنی کہانیوں کے اندر جس طرح کشمیری سماج کے دُکھ، درد اور مصائب و آلام کو پیش کیا ہے وہ ان کے ایک کامیاب ادیب ہونے کے ساتھ ہی درد مند اور حساس فرد ہونے کی بھی دلیل ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے اندر انسانی مسائل اور علاقے کے دُکھ، درد کو جس خوبصورت و مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی تخلیقات کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا ہے اور مصنف ایک کامیاب افسانہ نگاری کا ثبوت پیش کرنے میں کامراں نظر آتے ہیں۔

شیخ صاحب کے افسانے فنی اعتبار سے بھی کافی پختہ خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان کے یہاں پلاٹ پر اچھی گرفت، موضوع کی بہترین عکاسی، الفاظ کا خوبصورت استعمال، کرداروں کے مطابق مناسب مکالموں، حالات و واقعات میں بہترین تطبیق، سلیس و سادہ زبان کا استعمال، کامیاب منظر نگاری، حقیقت پسندی، گہری فکر اور زبان و بیان پر مکمل گرفت صاف طور پر نظر آتی ہے جو ان کے اسلوب نگارش کی نمائندہ خصوصیات ہیں اور ان کو بہترین ادیب و کامیاب افسانہ نویس ہونے کا اعزاز عطا کرتی ہیں۔

زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعے میں ۲۳ افسانے شامل ہیں جن میں کوئی تو ہے؟ میلا نوٹ، گمشدہ اشتہار، آدھا سچ، اماوس، اپنا دامن، اپنا ہاتھ، سم کارڈ، اپنا گھر، نمک حرام، پگلا کہیں کا، کوکھ کا زہر، پیر بابا، قابل ذکر ہیں۔ کتاب کا عنوان بنا ان کا ایک اہم افسانہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' کو ہم اس مجموعے کا نمائندہ افسانہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس افسانے کے ذریعے شیخ صاحب نے کشمیریوں کے موجودہ کرب کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے

مختصر یہ کہ شیخ بشیر احمد کے اس افسانوی مجموعے کی مذکورہ خوبیوں کو دیکھتے ہوئے توقع کی جاسکتی ہے کہ اردوداں حلقوں کی جانب سے اس کتاب کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اور ادب دوست حضرات سے داد و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر رضاء الرحمن عاکف سنبھلی
علامہ اقبال اسٹریٹ میاں سرائے، سنبھل (یو پی)
(بشکریہ ماہنامہ ایوان اردو)

..................☆☆☆..................

شیخ بشیر احمد کے افسانے

جموں و کشمیر اردو افسانوں کی روایت ماقبل آزادی سے چلی آرہی ہے۔ یہ افسانے مختلف رجحانات سے اثر لیتے ہوئے عصرِ حاضر کے سلگتے مسائل مثلاً دہشت گردی، معاشی واقتصادی بدحال، نسلی فسادات اور گلوبلائزیشن کے بداثرات کی ترجمانی کرنے لگے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ وادی میں آج ایسے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں جو پوری اردو دنیا میں اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ ان میں بہت سامنے کے نام ہیں۔ آنند لہر دیپک بدکی، نور شاہ، حامدی کاشمیری، مخمور بدخشی، ویریندر پٹواری، خالد حسین، ترنم ریاض، دیپک کنول، سیدہ نسرین نقاش، حسن ساہو وغیرہ۔ انہیں افسانہ نگاروں میں تیزی سے ابھرتا ہوا ایک نام شیخ بشیر احمد کا بھی ہے جو ۱۹۶۸ء سے اپنی تخلیقیت افروزیوں کا جواز فراہم کررہے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے کشمیر سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی زینت بنے۔ بیرونِ ریاست "ہند سماچار" میں بھی تسلسل سے شائع ہوتے رہے اور اب ملکی سطح پر وہ اخبارات ورسائل کی زینت بننے لگے ہیں۔ جس کے سبب ادبی حلقوں میں انہوں نے اپنی ایک انفرادی شناخت بنالی ہے۔

ان کے افسانوی سفر میں تعطل کا ایک طویل وقفہ بھی آیا جب ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۶ء کے دوران مسلسل پندرہ برسوں تک وادی کی صورتِ حال دھماکہ خیز بنی رہی۔ ہر شخص اپنی آنکھوں کے سامنے

موت کو رقص کرتا دیکھتا تھا۔ ایسے میں قلمکاروں نے بھی گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ نہ جانے کب کون موردِ الزم ٹھہرا کر دھر لیا جائے۔ بشیر احمد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ برف اس وقت پگھلی جب جموں کشمیر اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ سوئے اتفاق کہ بشیر احمد بھی اس کے ایک رکن بنائے گئے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ادبی شخصیتوں کی صحبت انہیں نصیب ہوئی۔ ادبی محفلوں میں آنا جانا شروع ہوا۔ اس طرح انہیں پھر سے لکھنے لکھانے کی تحریک ملی۔ ان کی تخلیقی سوتے پھر سے جاری ہو گئے جن میں اب بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔

ان کے افسانوں کا کینوس کافی پھیلا ہوا ہے۔ یوں تو آج کے جدید معاشرے کو درپیش سبھی مسائل پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے مگر بیشتر افسانے کشمیر کے پر آشوب ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کی تصویر کشی بھی ملتی ہے اور گزشتہ تین دہائیوں سے جاری سیاسی اتھل پتھل پر انہوں نے بڑی بیباکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ بقول نور شاہ۔ ''وہ موجودہ دور کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور معاشرتی حالات وحقائق کے حوالے سے اپنی کہانیوں کی بنیاد رکھتے ہیں اور ان کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔'' ان کے افسانوں میں شہری زندگی کے ساتھ دیہی زندگی کی معصومیت بھی ہے تو نچلے اور متوسط طبقے کی محرومیوں بھی پائی جاتی ہیں۔

''بند مٹھی سے بھاگا ہوا پرندہ'' ان کا اوّلین افسانوی مجموعہ ہے جس میں شامل بیشتر کہانیاں کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے افسانہ نگاری پر ان کی دسترس کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ مربوط پلاٹ، افسانے کی بنت اور بطور خاص ان کا نقطۂ ارتکاز چونکانے والا ہوتا ہے۔ بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن کا کلائمکس ہماری سوچ کو متحرک کرتا ہے۔ صرف دو تین مثالیں پیش ہیں۔ افسانہ ''باغی ستارہ'' ایک مفلوک الحال شخص آصف کی کہانی ہے۔ وہ شال میں سوزنی کا کام کر کے خوشحال زندگی گزارا کرتا تھا۔ کشمیر میں شورش کے برپا ہونے پر اسے کام ملنا بند ہو گیا۔ بیکاری میں بیوی اور دو بچوں کی پرورش اس کے لئے مسئلہ بن گئی۔ مگر غیور آدمی تھا۔ بیوی اگر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی تو اسے بہت برا لگتا اور دوسروں سے قرض مانگنے کے لئے اسے منع کرتا۔ ایک دن اس کے پرانے مہاجن نے کام دینے کے لئے شہر بلایا۔ دوسرے دن وہ کچھ ہزار روپے پیشگی لے کر خوشی خوشی آنکھوں میں رنگین سپنے سجائے گھر لوٹا تو بیٹے سے یہ سن کر کہ اس کی ماں رحیم درویش کے پاس جانے لگی ہے اور اس سے روپے لائی ہے تو اس کے ہوش اڑ گئے کیونکہ رحیم درویش ایک اوباش اور فریبی شخص تھا

۔کہانی اس جملے پر ختم ہوتی ہے۔''اس کی بیوی نسرین شفق بن چکی تھی اور رحیم درویش شمسی باغی ستارہ''۔یہ چونکانے والا فقرہ قاری کو دیر تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔''گمشدگی'' دو افسانہ نگاروں کی کہانی ہے۔دونوں میں بڑی دوستی تھی۔دونوں ملکی حالات اور لوگوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافی کے خلاف بڑی بیباکی سے لکھتے تھے۔ان میں اسے اچانک ایک کہیں غائب ہوجاتا ہے یا اغوا کرلیا جاتا ہے۔اس بات سے ساتھی افسانہ نگار دکھی ہوتا ہے اور اسے یاد کرتا رہتا ہے۔کافی دن گزر جاتے ہیں۔ایک روز پرانے اخبارات و رسائل کی گٹھری پر نظر پڑتی ہے تو رسائل الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔دوست کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔اس کہانی کا کلائمکس ان الفاظ پر ہوتا ہے۔''میرے سامنے اخباروں اور رسالوں کا ڈھیر پڑا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خود اپنے لفظوں کی صلیب پر کھڑا ہوں''۔افسانہ نگار کے ذہنی کرب کا یہ بلیغ اشاریہ شیخ بشیر احمد کی تخلیقی شادابیوں کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔اس طرح کے استعاراتی جملے ان کے بعض دیگر افسانوں میں بھی ہیں مگر ان سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اتنا عرض کروں گا کہ تلخ سچائیوں کے اظہار میں وہ ذہنی تحفظات سے بالاتر ہوکر براہ راست اظہار حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں۔یہ ان کی حق گوئی او ربیباکی کا واضح ثبوت ہے۔کشمیر کے پس منظر میں ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' سم کارڈ، کوئی تو ہے، پگلا کہیں کا، جیسے افسانے اسی ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں۔

جن میں دہشت گردی کے نام پر بے گناہوں کو گرفتار کر کے ایذا رسانی کی جاتی ہے۔دیگر افسانوں میں آدھا سچ، اپنا گھر، نمک حرام، کوکھ کا زہر وغیرہ میں سماجی اقتصادی اور نفسیاتی پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔یہ سبھی افسانے فنی لوازمات کی پاسداری کے ساتھ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور حقیقت پسندی کے مظہر ہیں جن سے شیخ بشیر احمد کی فکری طہارت، اصلاح پسندی اور تعمیری جذبوں کا پتہ چلتا ہے۔اپنے عمیق مشاہدات اور تجربات سے حرارت کشید کر کے روحِ عصر کو افسانوی سانچے میں ڈالنے کے ہنر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔''بند مٹھی سے بھاگا ہوا پرندہ'' ان کا اوّلین سنگِ میل ہے جس سے ان کے درخشاں مستقبل کی نشاندہی ہوتی ہے۔اس لئے امید واثق ہے کہ دوسرا سنگِ میل آتے آتے وہ اپنی منزل سے اور بھی قریب نظر آئیں گے۔ان کے فن میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا ہوگی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر ہوں گے۔

سعید رحمانی

ایڈیٹر۔'' ادبی محاذ '' دیوان بازار، کٹک (اڑیسہ)

☆☆☆



شیخ بشیر احمد کا افسانوں مجموعہ ''بند مٹھی سے بھاگا پرندہ'' پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ بشیر کی پلاٹ پر مضبوط گرفت ہے جب وہ کہانی کے پلاٹ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں تو کیا بساط ہے کہ ان گرفت سے چھوٹ کر باہر نکل جائے۔ کشمیر کے تشدد آمیز واقعات ان کے افسانوں کا خصوصی موضوع ہے۔ ہلاکتوں، دھماکوں اور خون ریزی میں افسانوں کے موضوعات تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اور وہ بھی ان حالات میں جب کہ یاس وغم، بے چینی، بے قراری کا احساس کسی افسانہ نگار کے روم روم میں مرتعش ہو گیا ہو۔ فکشن نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ انداز بیان شگفتہ ہو۔ حالات اور واقعات میں تسلسل ہو اور مکالمے برجستہ ہوں۔ بشیر کے افسانے اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا وہ لکھا۔ مبالغہ نہیں۔ تصنوّع نہیں۔ آرائشی زبان نہیں، فضول کی بیان بازی نہیں۔ غرض کہ ایک اچھے افسانہ نگار کی خوبیاں ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔

چند برسوں پہلے میں سیر و تفریح کے لئے کشمیر گیا تھا۔ سرینگر کے ایک اسٹور میں ہم لوگ کچھ خرید رہے تھے۔ اچانک بھرے بازار میں بھگڈر مچ گئی۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ لیکن دکاندار کے ماتھے کی شکن تک نہ ہلی۔ میں نے دکاندار سے پوچھا ''یہ بھگڈر کیوں مچی ہے!'' دکاندار نے نہایت حلیمی کے ساتھ کہا ''صاحب! یہ روز کی بات ہے۔ آپ فکر نہ کریں، سو سوالات کا یہ ایک جواب ہے۔ ایسا ہی ماحول مجھے کہانی ''کوئی تو ہے......؟ پڑھ کر یاد آیا۔ درد جب حد سے گذرتا ہے دوا بن جاتا ہے۔

کشمیر کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں ۔ ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ کشمیر میں امن و امان خوش حالی اور سکون لوٹ آئے گا۔ وادی میں گولیوں کی جگہ سنتور کی دھنیں گونجنے لگیں گی۔ امن و شانتی کا ''بند مٹھی سے بھاگا ہو پرندہ'' اپنے آشیانہ میں واپس لوٹ آئیگا۔

قاضی مشتاق احمد

پونہ مہاراشٹر



مجھے شیخ بشیر احمد کے افسانوی مجموعے "بنڈمُنڈی سے بھاگا پرندہ" کی کہانیاں پڑھ کر خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔ حیرت اس لیے کہ جس مہارت اور پختگی سے افسانے لکھے ہیں کہیں بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔

افسانے پہ ان کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ جس سے ان کے مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان اتنی سادہ عام فہم اور سلیس ہے کہ سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔

ان کے بیشتر افسانوں میں کشمیر کی وادیوں کی خوشبو، اُس کا درد عوام نے جو اتنے سالوں میں تکلیف دیکھی ہے، کرب سہا ہے، اذیتیں برداشت کی ہیں، اُسے انہوں نے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر قاری سے اس درد کو بانٹا بھی ہے اور اُسے اپنے درد میں شریک بھی کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال "کوئی تو ہے"۔۔؟، "گمشدہ اشتہار" "بنڈمُنڈی سے بھگا پرندہ" میں ملتی ہے۔

ایک مرد افسانہ نگار ہو کر بھی ان کی ہاں عورت سے پوری ہمدردی ہے۔ چاہے وہ "پرموشن" کی رضیہ ہو، "پگلا کہیں کا" کی نوری ہو، "اماوس" کی رُکمنی ہو، یا گمشدہ اشتہار" کی لاچار بے بس ماں ہو، موجودہ دور کے والدین کی مجبوریوں کو بخوبی "اپنا دامن اپنا ہاتھ" میں بیان کیا ہے۔ "میلا نوٹ" بھی قابل تعریف افسانہ ہے۔ سارے افسانے میں دلچسپی بنی رہتی ہے۔ انسانی درد کو بہت خوبی سے محسوس بھی کیا ہے۔ اِس افسانے میں سبھی خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب افسانے میں ہونی چاہیں غرض یہ کہ بشیر احمد صاحب کی محنت رنگ لائی ہے۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ ان کے آیندہ مجموعے بھی قاری کو اپنے ساتھ بہالے جائے گے۔! اسے اپنے رنگ میں رنگنے کا ہنر بشیر احمد صاحب خوب جانتے ہیں......دُعا کرتی ہوں کہ زورِ قلم اور زیادہ !

ڈاکٹر رینو بہل ایم اے۔ پی ایچ ڈی

چنڈی گڑھ





''بند مٹھی سے بھا گا پرندہ'' شیخ بشیر احمد کے افسانوی مجموعے کا نام ہے۔ مجھے یہ مجموعہ پڑھنے کا شرف حال حال ہی میں نصیب ہوا۔ جہاں تک میری یاداشت کا تعلق ہے مجھے لگتا ہے کہ شیخ بشیر احمد کو میں برسوں پہلے سے غائبانہ طور جانتا ہوں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں روزنامہ ''چنار'' کا ادبی ایڈیشن دیکھا کرتا تھا۔ نہ جانے وہ اتفاقی شگوفے کی طرح ادبی زمین سے نمو پا کر پھر اچانک کہاں غائب ہو گئے۔

پہلی بار میں جب شیخ بشیر سے ملا تو اُن کی قد کاٹھی دیکھ کر میں چونک پڑا۔ شیخ بشیر تن و توش کا آدمی ہے پر قد کے ذرا ٹھنگنے ہیں۔ اوپر سے اُنہوں نے ایک لمبی سی داڑھی اُگا کر رکھی ہے جسے اُنہوں نے مہندی سے رنگ لیا ہے۔ اُسے دیکھ کر یہی گمان گزرتا ہے کہ وہ یا تو کسی مسجد کے مولوی ہیں یا کسی دینی اسکول کے مدرس۔ میں یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ ادیب نہ ہوتے تو ایک اچھے کامڈین ہوتے کیونکہ بذلہ سنجی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اگر سنجیدہ بات بھی کرتے ہیں تو اُسمیں سے بھی مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔

تو ہاں بات ہو رہی تھی اُسکے افسانوی مجموعے ''بند مٹھی سے بھا گا پرندے'' کی۔ یہ غالباً شیخ بشیر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے گاہے گاہے پڑھنے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر افسانے میں نے پہلے ہی پڑھ لئے ہیں۔ شیخ بشیر احمد بھی کشمیر کے دیگر قلم کاروں کی طرح وادی کے بدالتے حالات سے لاتعلق نہ رہ سکے۔ دو دہائیوں تک کشمیر جس پر آشوب دور سے گزرا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ بیشتر ادیبوں نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اُنہیں ادب سے زیادہ اپنی بقا کی فکر لاحق رہی۔ اُن گوشہ نشینوں میں یہ احقر بھی شامل ہے۔ سن نوے سے لیکر 1996 تک مجھ پر جمود طاری رہا اور میں اپنی ہی ذات میں گم ہو کر رہ گیا۔ مجھے پھر سے فعال بنانے میں سیفی سرونجی کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے مجھے پھر سے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا۔ جب میں نے قلم پھر سے ہاتھ میں تھاما تو میرے دل کا سارا درد چھلک کر باہر آنے لگا۔ اسی طرح شیخ بشیر نے بھی جب قلم اُٹھایا تو اُس نے اپنے قلم سے بے ایمانی نہیں کی۔ اُسنے اپنے ضمیر سے غداری نہیں کی۔ اُسنے بے خوف ہو کے لکھا جب کہ

کچھ قلم کار ابن الوقت ثابت ہوئے۔ اُنہوں نے اس قتل وغارت گری کے دور میں اپنے ضمیر کا سودا کر کے، معصوموں اور بے گناہوں کے خون سے اپنی آسائشوں کے جام بھر کے اپنی راتیں رنگین بنالیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے سود وزیاں کی پرواہ نہ کر کے گناہ گاروں کو بے نقاب کرنے کا بیڑہ اُٹھالیا جسکی اُنہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ کئی ایک تو اس نیک عمل میں اپنی جان گنوا بیٹھے۔ کئی تو اپنے ہی ملک میں مہاجر بن کر رہ گیئے۔

ایک ادیب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ ہی لکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے۔ جو غیر جانبداری سے اپنا فرض ادا کرے وہی سب سے اچھا اور سچا ادیب ہوتا ہے۔ ایک قلم کار کا کام ہے کہ وہ سماج میں پھیلی برائیوں کی نشاندہی کرے۔ وہ اپنی طرف سے کسی بھی واقعے میں جھوٹ کا تڑکا نہ لگائے۔ یہ سب سے بڑی بددیانتی ہوگی۔ اگر وہ سچ بات کہنے کا باک رکھتا ہے تو اُسے کسی سے بھی ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں شیخ بشیر احمد کی ہمت کی داد دیتا ہوں کی اُنہوں نے اپنے مافی الضمیر پر کسی طرح کے خوف ودہشت کو حاوی ہونے نہ دیا اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کی عسکری پسند طاقتیں اُسے خفا بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ ''کوئی تو ہے'' کہانی پڑھکر دیکھیئے۔ آپ شیخ بشیر احمد کے حوصلے کی سراہنا کیئے بنا نہیں رہ پائیں گے۔ اُنہوں نے کہیں پر بھی سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہہ کر اپنا دامن تو نہیں چھڑالیا۔ اُنہوں نے وہی کہا جو دیکھا، جو محسوس کیا۔

اس بات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں سے کشمیر جس پُر آشوب دور سے گزرا اس نے کسی بھی ذی حس کو سوچنے پر مجبور کیا۔ ایسے دلدوز واقعات رونما ہوئے جن کو دیکھ کر پتھروں کے کلیجے بھی شق ہوئے۔ شیخ بشیر کی کہانیاں اُن ہی لرزہ خیز واقعات کی آئینہ دار ہیں جنہوں نے انسانیت کو شرمسار کر کے رکھ دیا۔ مجھے شیخ بشیر کا کہانی بیان کرنے کا انداز بڑا اچھا لگا۔ وہ بات کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے لئے ایک پرخلوص مشورہ ہے۔ وہ بے وجہ اور غیر ضروری تشبیہات سے احتراز کیا کریں۔ کبھی کبھی وہ مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنی ہی کہی ہوئی بات کی نفی کر بیٹھتے ہیں۔ ایک اور بات جو مجھے بر طرح کھٹکی۔ وہ یہ کہ کتاب میں اتنی ساری کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں جنہیں دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔ شیخ بشیر کو کتاب چھاپنے سے پہلے مواد کو ایک بار دیکھ لینا چاہے تھا۔

میں اُنہیں یہ کتاب چھاپنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن کی کامیابی کے لئے دعا

گو ہوں۔ خدا کرے کہ وہ اسی طرح فعال رہیں اور ہمیں مستقبل میں بھی اُن کی اچھی اچھی کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہیں۔

دیپک کنول۔ بمبئی



چند ہفتے قبل، جب میں اپنے کمرے میں نہ جانے کن اُلجھنوں کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اچانک میرے غریب خانے پر میرے عزیز اور شفیق شیخ بشیر احمد جلوہ افروز ہوئے۔ اور سالہا سال کے بعد اُنکو اپنے سامنے دیکھ کر میرے دل میں مسرت واستعجاب کی لہریں موجزن ہوئیں۔ میں شیخ بشیر احمد کو اُن کے ابتدائی لڑکپن سے جانتا ہوں۔ کیونکہ اُن کے برادر اکبر شیخ محمد صدیق مرحوم میرے گہرے دوست، اور ہم جماعتی تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ گھریلو تعلقات تھے۔ اور کئی دہائیوں تک ایک ساتھ محکمہ تعلیم میں، ہم دونوں کو مختلف کلیدی عہدوں پر نونہالوں کی آبیاری کا موقع ملا۔

آج سالہا سال کے بعد شیخ بشیر احمد کو دیکھ کر مجھے اُن کا وہ معصوم اور متبسم گول گول چہرہ یاد آیا۔ جب وہ ابتدائی لڑکپن کے دور سے گزر رہے تھے۔ نہایت حلیم، شرمیلے، پر شفقت اور معصومیت کا لامثال پیکر۔!!

اس ملاقات کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور مجھے اُنکی اَدبی خدمات کا بھرپور تعارف ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے اُنکی کتاب "بند مٹھی سے بھاگا پرندہ" اور اُن کے تازہ ترین مسودے "شیشے کی دیوار" کو دیکھنے کا موقع ملا۔

اِن نگارشات کو پڑھکر مجھے کافی مسرت ہوئی۔ شیخ بشیر احمد کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ ریاستی ماحول کے پیدا کردہ روحانی کرب اور بدلتے حالات کے ذہنی انتشار، اقتصادی اُلجھاؤ اور نفسیاتی قدر جزر نے اُنکو حد درجہ متاثر کر کے نئے نئے پیکر تراشنے اور حالات واقعات کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے ایک نئے انداز سے اُنکو صفحہ قرطاس پر پیش کرنے کا اعتماد بخشا ہے۔ اُن کے کرداروں میں، اُن کی سحر انگیز سلاست میں، اُنکے قلم کی پُر اعتماد روانی میں ایک منجھا ہوا فنکار نظر آتا ہے۔ جو ایک ماہر سرجن کی طرح انسانی کرداروں کی گوناگوں اُلجھنوں کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے۔ انسان کے اندر دبیز

پردوں میں چھپے ہوئے فرشتوں اور شیطانوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ اور اپنا کوئی فیصلہ سنائے بغیر قارئین پر فیصلہ چھوڑتا ہے۔

ان کی زبان میں چاشنی ہے۔ مٹھاس ہے۔ حلاوت ہے اور انسانی جذبات کو بے کم و کاست منظرِ عام پر لانے کا فن نظر آتا ہے۔

میر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنکو مزید ادبی شاہکار تراشنے کے لئے اور ادبی خدمات انجام دینے کے لئے زور قلم اور زیادہ عطا فرمائے۔ کیونکہ ایسے پرخلوص قلم کار روز روز جنم نہیں لیتے۔

شہید سلمانی۔ سرینگر

..................☆☆☆..................